۶۔ انہیں جماعت میں نہ ملانا چاہیئے۔

تجزیہ و تبصرہ:۔ یہ اختلافات بنیادی قسم کے ہیں۔ اس لئے ان پر مفصل کلام کرنا ضروری ہے۔ ہم بتا چکے ہیں کہ مسلمان کے جرم کے خلاف عناد اور مجرم کے حق میں اصلاح و ہمدردی کا رویہ رکھنا ضروری ہے۔ ڈاکٹر بیماری سے نفرت برتتا ہے نہ کہ بیمار سے۔ بیمار جس قدر بے باک ہوگا اسی قدر ہمدردی کا زیادہ مستحق ہوگا۔ اس پہلو سے اگر آپ غور کریں تو اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں صاحب کا کردار کچھ بھی قابلِ رشک نہیں۔ ہماری بدقسمتی کہ ان کے حق میں شیخ الاسلام اور مجدد ملت جیسے الفاظ کا استعمال درست نہیں۔ تاریخ سے کسی ایسے امام اور مجدد کا سراغ نہیں پہنچایا جا سکتا جس نے مسلمانوں کی تعلیم و اصلاح کا کام چھوڑ کر فتویٰ بازی اور فرقہ سازی کا قلم دان سنبھالا ہو۔ حضرت امام اعظمؒ سے لے کر حضرت مجدد سرہندی اور شاہ ولی اللہ تک ہر دور میں مسلم معاشرہ شرک و بدعات سے آلودہ رہا۔ مگر سوائے خوارج و معتزلہ کے کسی نے فتویٰ یا تلوار سے اس کی صفائی نہیں کی۔ خود اسی برِ عظیم میں دین الٰہی کا فتنہ

ؔ فتاویٰ رضویہ $\frac{۳}{۲۲۲}$

بادشاہ کی سرکردگی میں اٹھا جسے علماء تک گئے۔ اس وقت حضرت مجدد نے اور سب کچھ کیا مگر ان میں سے کسی کو کافر و مرتد نہیں گردانا۔ امام اور مجدد تو بعد میں رہے۔ حضرت علیؓ نے خلافت و اقتدار کا مالک ہونے کے باوجود اپنے باغیوں اور مکفرین خوارج کو کافر نہیں ٹھیرایا تھا۔ ان میں سے جو بھی ملتا آپ اسے نئے سر سے مسلمان بنائے بغیر اپنے ساتھ ملا لیتے تھے۔ اور جو نہیں ملتا اُسے امن سے اپنے غلط عقیدہ پر قائم رہنے کی آپ اجازت دیتے تھے۔ اس سے بھی بڑھ کر قرآن میں بنی اسرائیل کے متعلق ہے کہ انہیں حضرت موسیٰؑ نے فرمایا تھا کہ اللہ تمہیں ایک گائے ذبح کرنے کا حکم فرماتا ہے۔ انہوں نے کہا۔ یہ تو ہم سے کیا مذاق کرتا ہے۔ ایک موقعہ پر انہوں نے حضرت موسیٰ سے یہ فرمائش بھی کر ڈالی ہمارے لئے بت پرست قوموں کے خداؤں کی طرح کا ایک خدا بنا لاؤ۔ دونوں مواقع پر آنجنابؑ نے انہیں جہالت کا علاج دیا۔ اور یہ نہیں فرمایا کہ تم کافر ہو گئے ہو۔ یہ اس وقت کہ اللہ کا رسول خود ان کے پاس اللہ کا حکم پہنچا رہا تھا۔ اور وہ خدا اور رسول سے کٹتے اور رہتے تھے۔ پھر کہاں وہ اور کہاں آج کے مسلمان۔

یہ صریح نص ہے اس بارہ میں کہ جو لوگ اسلام قبول کر چکے ہوں اُن کے کفر و شرک پر گرفت کرنا بڑے احتیاط کا کام ہے۔ اور یہاں تو حالات یہ ہیں کہ کوئی سیدھا کلمہ ادا کرنے والا بھی مل جائے تو اُسے گلے لگانا چاہیئے۔ اگر خان صاحب مرحوم کا مقصد اس فتویٰ بازی سے اصلاح تھا تو وہ ناکام رہے ہیں۔ اور اگر مقصود ایک لڑنے جھگڑنے والا فرقہ کھڑا کرنا تھا تو آپ کی کامیابی میں شُبہ نہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ اس سے دیوبند کے مرکزِ علم ہونے میں رتی برابر فرق نہیں آیا۔ جو ثبوت ہے اس بات کا کہ جناب کا کیس کمزور تھا۔ مناسب یہ تھا کہ غلط کاروں کو کافر مرتد کہے بغیر دلائل کے ساتھ اُن کی غلطی اُن پر اور پھر عوام پر واضح کی جاتی۔ یہ مفروضہ کسی طرح صحیح نہ تھا کہ وہ فتویٰ کے خوف سے کانپ کر آپ کے قدموں پر گریں گے۔ معافی مانگیں گے اور جو ایسا نہ کرے گا قتل کر ڈالا جائے گا۔ ایسے حال میں آخر فتویٰ کس مرض کا علاج ثابت ہُوا؟

دوسری بڑی غلطی بریلوی اور موحدین دونوں میں یہ ہے کہ اُن کے ہاں صحت عقائد کا معیار تخلیقی۔ اور

اس کا اہتمام عمل سے زیادہ ہے۔ حالانکہ اسلام اور عقل کا تقاضا اس کے اُلٹ ہے۔ کون نہیں جانتا کہ خلافت راشدہ اور اس کے قریبی دور میں جو علاقوں کے علاقے اور آبادی کی آبادیاں مسلمان ہوجاتی تھیں تو یہ مسلمانوں کے اچھے عمل کی وجہ سے تھا نہ کہ ان کے اچھے عقیدہ کی وجہ سے۔ کیونکہ عقیدہ میں تو ان کے ابتدائی مکی دور میں بھی کوئی خرابی نہ تھی۔ صرف وہاں اچھے عقیدہ کے مطابق اچھے عمل کی آزادی حاصل نہ تھی۔ اس لئے ان کے اچھے عقیدہ میں کوئی کشش نہ تھی۔ ہجرت کے بعد جب عمل کی آزادی میسر آئی اور لوگوں نے اسلامی معاشرہ کو عملاً تعمیر ہوتے دیکھا تو بعد میں سماں یہ تھا کہ مسلمان تجارت کرنے کو جاتے تھے اور شہروں کو مسلمان بنا کر آتے تھے۔ مُسلمان تو مُسلمان رہے۔ غیر مُسلم ان کے اچھے عمل کو دیکھ کر اپنی بُری رسُومات کو گندے ورثہ کی طرح نفرت کے ساتھ چھوڑ دیتے تھے۔ صُورت حال اِس وقت یہ ہے کہ ہر فریق عقائد کی لڑائی لڑ رہا ہے اور عمل کی طرف سے آنکھیں بند ہیں۔ اب ہم ان فتووں کو لیں گے۔

فتویٰ اوّل:- اس ضمن میں سرفہرست - ہنگامہ خیز
اور دل ہلا دینے والا فتویٰ امکان کذب کا مسئلہ ہے - جو
حقیقت میں پرِ پشہ کے برابر بھی نہیں - مگر خانصاحب
نے اسے اس انداز کے ساتھ لیا ہے کہ اس سے کرۂ
زمین تو کیا چودہ طبق لرز اُٹھے ہیں - وجہ یہ کہ مخالفانہ
عنوانات میں مخالفانہ انداز سے دوسرے کی بات کو
پیش کیا - حقیقت آدھی یا ساری یا صحیح نگاہوں سے
اوجھل رہی اور کافر کافر کے تکرار سے کان پک گئے -
یہ آزادی شائد وہابیوں کے حاکم کی خصوصیات میں[ؔ1]
سے ہے - مخالف بے دین سہی - مگر اس کی پوری بات تو
بتائی جائے - امکان کذب کا مطلب یہ سوال ہے کہ
آیا خدا تعالےٰ جھوٹ اور دوسری بُرائیوں پر قادر ہے یا
نہیں - بظاہر اس کے جواب میں "ہاں یا نہیں" سے
یکساں کفر لازم آتا ہے - ہاں میں بُرائی اور نہیں میں
بے بسی - مگر حقیقت میں ہاں کہنا کفر نہیں - کیونکہ جیسا

[1] قرآن میں انتہا درجہ کے چغل خور اور حرام کے عاشق یہود کے بارے میں رسول خدا
سے فرمایا گیا کہ اگر وہ آئیں تو ان کا مقدمہ چکانا آپ پر ضروری نہیں -
لیکن اگر چکانا چاہو تو انصاف کے ساتھ چکاؤ - خانصاحب خود ہی وہابیوں
کے حکم بن گئے اور کسی وکیل دلیل اور اپیل کی ضرورت نہیں دیکھی -

خدا تعالےٰ بلا استثنا ہر چیز پر قادر ہے تو اُسے غلطی سمیت
ہر چیز پر قادر ہونا چاہیئے - یہ اس وقت ہے کہ اِس
جواب کو اس کی ڈراؤنی صورت میں لیا جائے - اس
وقت بھی یہ قرآن کے خلاف نہیں پڑتا - اور اس کی
آسان شکل یہ ہے کہ جب خدا ایک بُرائی کو اختیار
کرلے تو وہ بُرائی رہیگی کہاں؟ وہ تو نیکی ہوجائے گی -
کیونکہ نیکی اصل میں خدا کے فیصلہ اور حکم سے نیکی ہوئی
ہے - یہی حکم اور فیصلہ اگر خدا بُرائی کے حق میں کردے
تو وہی نیکی ہوجائے گی - تبدیل نہ ہونے والے مسلمات
تمام تر مخلوق کے لئے ہیں - خدا جو مسلمات کا خالق ہے -
اس کے لئے اَن ہونی بات کوئی بھی نہیں - بخلاف اِس
کے اگر نہیں کہاں جائے تو اس کا مطلب ہوگا کہ خدا
ایسے کام پر قادر نہیں جو ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے
اور وہ ہم سے بھی زیادہ عاجز ہے - ہم بُرائی پر بھی بخوبی
قادر ہیں اور اپنی بنائی ہوئی چیز کے قائم رکھنے یا مٹانے
پر بھی قادر ہیں -

خانصاحب کہتے ہیں کہ ہاں کہنا کفر ہے اور نہیں کہنا
ثواب - کیوں؟ اس لئے کہ ہاں کہنے سے خدا کو بری صفات
کا مالک ماننا لازم آتا ہے - اور نہیں کہنے میں کوئی خرابی

نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت اپنے فتوائے کفر
کے جوش میں بات کو سمجھ ہی نہیں پائے ورنہ کہاں
امکان اور کہاں اتصاف۔ زید کے چوری پر قادر ہونے
اور اس کے چور ماننے میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔
پہلی بات سے اس کی شرافت و بزرگی میں کوئی فرق
نہیں آتا۔ بلکہ وہ شریف اور بزرگ ہوتا ہی جب
ہے کہ طاقت رکھتے ہوئے چوری اور قتل سے بچے۔
خانصاحب دونوں باتوں کو ایک درجہ میں رکھ کر لگے
خدا کی صفات کے انکار میں آیتیں اور فقہ کی عبارتیں
لانے حالانکہ خدا کو بری صفات والا کوئی بے دین یا مسخرہ
ہی کر سکتا ہے۔ اس کے باوجود حضرت اپنی غلطی کو
چھوڑ کر فتویٰ کا نشانہ اس کو بناتے ہیں جو خدا کو بری
صفات سے پاک قادر مطلق اور اچھی صفات کا مالک
بتاتا ہے۔ اسے کہتے ہیں اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ اگرچہ
ایسے لایعنی سوالات کے وقت سلامتی اسی میں ہے
کہ آدمی جواب میں کہے! میں نہیں جانتا اور جن
باتوں کا فیصلہ خدا نے نہیں کیا ہے ان کے متعلق
مجھے نہ جاننا چاہیئے۔
اختیار غیب کا قصہ یہ ہے کہ شاہ اسماعیل کہیں

کہہ بیٹھے کہ غیب کا حال جاننا خدا کے اختیار میں ہے۔
کسی اور کے اختیار میں نہیں۔ خانصاحب نے آؤ دیکھا نہ
تاؤ اور فریب پر فتوی جڑ دیا کہ اختیاری چیز حادث
اور قابل ترک ہوتی ہے۔ علم خدا کی صفت ہے۔ اور اس
میں اختیار راہ نہیں پاتا۔ عقیدہ شاہ اسماعیل شہید کا
بھی یہی ہے۔ ورنہ اگر وہ صفات کو حادث بتاتے تو
اس کے لئے کوئی اور عنوان لاتے۔ یہ صرف انداز بیان
کا فرق ہے۔ انہوں نے جب بندوں کا بے اختیار ہونا
ذکر کیا تو ساتھ ہی خدا کے اختیار کا ذکر کر دیا۔ اردو میں
جب کہا جاتا ہے کہ آدمی کی زندگی اور روزی خدا کے
اختیار میں ہے تو اس سے یہ کبھی نہیں سمجھا جاتا کہ خدا
کی ذاتی صفات کا انکار ہو رہا ہے۔
چمار کا تذکرہ بھی شاہ اسماعیل شہید نے کیا ہے۔
انہوں نے لکھا ہے کہ خدا کو چھوڑ کر دوسروں سے مدد
مانگنا ایسا ہے جیسے بادشاہ کو چھوڑ کر ایک چمار کی پناہ
میں جائے۔ انہوں نے کہا ہے کہ غلام کے لیئے اپنے
بادشاہ کو چھوڑ کر کسی دوسرے بادشاہ کی امداد لینا بھی
ٹھیک نہیں۔ اس بے مثال تشبیہہ کی نزاکت پر کم
ہی غور کیا جاتا ہے۔ یہ جس قدر دور رس ہے اسی قدر

حقیقت ہے۔ مبالغہ بالکل نہیں مگر بُرا ہو عناد کا
اسے ہنسی کا سامان بنانے والے اس کی قدر
نہیں کرتے۔

چمیار ایک انسان اشرف المخلوقات ہے اس دُنیا
میں سینکڑوں بادشاہ چمیار اور چمیار بادشاہ ہوئے ناممکن
بات یہ ہے کہ ایک مخلوق ہستی خُدا ہو جائے۔ پھر اس
تشبیہ میں خُدا کے سوا جن معبود ہستیوں کو چمیار کے
کے برابر کہا گیا ہے اس میں رسولِ خُدا کی کیا توہین
ہے۔ قُرآن میں تو جھوٹے معبودوں کو مچھروں اور مکھیوں
کے برابر اور اس سے بڑھ کر انہیں جہنم کے پتھر فرمایا
گیا ہے۔ حالانکہ ان میں حضرت عیسیٰؑ اور حضرت عزیرؑ
بھی تھے۔ چنانچہ مخالفین نے اِس پہلو سے قرآن پر
اعتراض بھی کیا تھا۔ مگر خُدا نے اُن کے اعتراض کی
پرواہ نہ کی۔ معلوم ہُوا کہ خُدا نے جن معبُودوں کی
تذلیل کی ان میں حضرت عیسیٰؑ شامل نہ تھے۔ مشرکین
البتہ ان کی آڑ میں اپنے شرک کو چھپانا چاہتے تھے
یہاں بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔

نماز میں مقربانِ خُدا کا خیال گدھے کے خیال سے
برابر ہونا بھی شاہ اسماعیل نے بیان کیا ہے۔ اِس میں

رسولِ خُدا کا تذکرہ لاتے سے تصورِ شیخ کی نفی میں
مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔ تصورِ شیخ صوفیاءِ کرام کا
بہت بڑا مسئلہ ہے۔ اس کا مطلب ہوتا ہے کہ مرید
نماز میں اور ہر وقت اپنے پیر کی صورت کو اپنے
سامنے رکھے، شاہ اسماعیل اسے شرک جانتے ہیں۔
انہوں نے کہا کہ شیخ وغیرہ تو کیا رسولِ خُدا کا تصور
باندھنا بھی گدھے کا تصور باندھنے سے بُرا ہے۔ وجہ
یہ کہ وہ شرک ہے اور یہ شرک نہیں۔ شرک اور
بُت پرستی اصل میں غیر اللہ کی پوجا ہے، اور غیراللہ
کی عبادت میں یہ نہیں ہوتا کہ اگر کسی بڑی ہستی
کی پوجا کی جائے تو گناہ کم ہو اور معمولی چیز کی پوجا
میں زیادہ گناہ ہو۔ بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔
اگر کوئی آدمی قرآن کو خُدا کا مقام دے کر اس کی پوجا
کرنے لگ جائے تو وہ عام بُت پرستوں سے زیادہ
مجرم ہوگا۔ اور یہ اس کے عمل کی ظاہری شکل کے
اعتبار سے نہیں اور نہ اس وجہ سے قرآن معاذاللہ
بتوں سے بُرا ہے۔ بلکہ اس وجہ سے ہوگا کہ وہ خُدا کی
ہدایت کے خلاف چلا اور جو کتاب ذریعہ ہدایت تھی
اسی کو اس نے ذریعہ ضلالت بنا ڈالا۔ اور دوہرا

ظلم کیا ایک آدمی اگر نماز میں گدھے کا تصور باندھتا ہے
تو یہ گدھے پر کوئی ظلم نہیں - کیونکہ گدھے نے اس
خدا کی توحید و عبادت کا درس نہیں دیا - لیکن
رسولِ خدا نے تو لوگوں کو توحید و عبادت الٰہی کا
سبق دیا ہے - آپ ہی کی ذات کو اگر خدا کا شریک
بنایا جائے تو اس سے بڑا ظلم اور کوئی ہو نہیں سکتا
اور بحث یاد اور محبت کی بھی نہیں - کیونکہ نماز میں
رسولِ خدا پر سلام اور درود بھیجا جاتا ہے تو آپ کی یا
بھی آتی ہے اور محبت بھی پیدا ہوتی ہے - بحث ا
عمل سے ہے کہ احساس عبادت اور احساس فرض
کے تحت آدمی نماز میں خدا کی بندگی کا خیال چھوڑ کر
تصورِ رسول میں محو ہو جائے - اس کا نتیجہ شرک کے
سوا اور کوئی نہیں - یہی کچھ شاہ اسماعیل نے لکھا
ہے - اور خانصاحب نے اسے اس انداز میں لیا گو
شاہ اسمٰعیل کو گدھے کے ساتھ عقیدت و محبت تھی
اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نفرت
عداوت تھی - حالانکہ جب وہ کلمہ اور درود پڑھتے
تھے - گدھوں سے دور رہتے تھے - اور مسلمانوں جیسے
اعمال کرتے تھے تو ان کے متعلق ایسا خیال قا

کرنے کی ضرورت نہ تھی - آدمی کی بات کا مطلب کچھ
تو اس کے حالات کے مطابق بھی لینا چاہیئے -

اعلیٰ حضرت کا اپنا یہ حال ہے کہ نہلے پر دہلا مارتے
مارتے ایسے مسائل سے دوچار ہوتے ہیں جنہیں برسوں
کی سوچ بچار کے بعد زبان پر لانا چاہیئے - علم رسول
پر بحث کرتے کرتے جناب نے مقابلہ کی جو ٹھانی تو
کہہ گئے کہ اگر رسول خدا کا علم جزوی ہے تو خدا تعالےٰ
کی قدرت بھی جزوی ہے - وہ اپنی ذات اور صفات پر
قدرت نہیں رکھتا - اس لئے ہر چیز پر قادر نہیں - ورنہ
خدا نہیں رہے گا - کیونکہ جو مقدور ہے ممکن ہے اور
جو ممکن ہے خدا نہیں - یہ صغریٰ و کبریٰ اس شان
سے ملاتے گویا یہ قرآن کی کوئی آیت ہے - جس
میں خدا نے فیصلہ فرمایا ہے کہ میں اپنی ذات اور
صفات پر قادر نہیں - یا یہ کہ میری ذات و صفات پر
قادر ہونے کے بارہ میں تم فیصلہ کے مجاز ہو - اگر کسی
سے اس طرح کا کوئی سوال بھی ہو تو محتاط آدمی کا
فرض ہے کہ وہ جواب میں اپنی لاعلمی کا اظہار کردے -
اس منطق سے تو ظاہر ہے کہ مادیین کی منطق راہ پاتی

[illegible] ۱۳

ہے کہ جو محسوس نہیں وہ ہے نہیں اور جو ہے نہیں
خدا نہیں" منطق ہونے کے اعتبار سے اس میں اور
اس میں کوئی فرق نہیں۔ قرآن کی کسی آیت کا
مضمون نہ وہ ہے اور نہ یہ۔ خدا ہر چیز پر قادر ہے
اور قصہ ختم۔

امکان مثل خاتم انبیاء کا مسئلہ یہ سوال ہے کہ کیا
خدا محمد صلے اللہ علیہ وسلم جیسا کوئی اور وجود پیدا
کرنے پر قادر ہے یا نہیں۔ خانصاحب نے فرمایا کہ
اہل حق اس بات کو محال بتاتے ہیں۔ کس کے حق
میں۔ (ظاہر ہے کہ خدا تعالےٰ کے حق میں) اور یہ دلیل
بھی دے ڈالی کہ خدا نے آپ کو خاتم انبیاء فرمایا ہے
اگر وہ کوئی آپ جیسا اور پیدا کرنے پر قادر ہونے لگے تو یہ جھوٹ کے
بغیر اور کیا ہو سکتا ہے۔ کیونکہ وہ پیدا کرنے پر قادر
ہوا اور ختم نبوت کا اصول ٹوٹا۔ شاہ اسماعیل نے کہا
کہ یہ تو اس وقت ہو کہ اگر وہ ایسا کرے بھی اور لوگوں کو
اس کے تصرف کا پتہ چلے۔ خدا تو اس پر بھی قادر
ہے کہ قرآن کو یا [illegible] یا اس کے کسی حصہ کو
لوگوں کے دلوں سے بھلا دے اور منسوخ کر دے بس

۱؎ کوکب شہابیہ صفحہ ۱۳ مولانا گنگوہی صاحب بھی کہتے ہیں کہ خدا اپنے وعدہ پر قائم رہتے ہوئے کسی اور نبی کو ہرگز پیدا نہیں کریگا اس کے بعد یہ نزاع محض لفظی ہے۔

ظاہر کیا تھا۔ فتوائے کفر! بیچارے معتزلہ نے بھی خدا
پر عدل واجب ٹھہرا کر یہی کچھ کیا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ
اگر ہم خدا پر عدل واجب نہ مانیں تو کچھ بھروسہ نہیں کہ وہ
ہمارے ساتھ انصاف کرے۔ یہ بھی وہی بات ہے۔ خدا کو
قادر مانا اور ختم نبوت کا شیشہ پاش پاش ہوا۔

حیرت تو یہ ہے کہ معتزلہ و متکلمین صفات کی بحثوں میں
کہیں سے کہیں جا نکلے مگر فتوائے کفر سے بچے رہے۔ ان کے
سامنے یہ سوال بھی آچکا ہے کہ خدا جو ہر چیز پر قادر ہے۔ کیا
وہ اپنے جیسا کوئی اور خدا بنانے پر قادر ہے؟ کسی نے ہاں کہا
اور کسی نے نہیں۔ اور کافر کوئی بھی نہ ہوا۱؎۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم
بہرحال خدا کی مخلوق ہی ہیں۔ اور مخلوق جیسی مخلوق بنانے پر خدا
کے قادر ہونے میں کسی کے ہاں اختلاف نہیں۲؎۔ اس لئے کہ ہم اپنی
بنائی ہوئی چیز پر اور اس جیسی اور بنانے پر قادر ہیں۔ خدا کیوں
نا قادر ہو۔ یہ اصل میں "شان رسالت" بڑھانے کا ایک اندھا جوش
ہے۔ پھر امکان کذب سے تو اس کو دور کا بھی واسطہ نہیں۔ یہ صرف
خدا کو ادھورا قادر ماننے سے پیدا ہوا۔ یعنی وہ آنحضور کی مثل تو

۱؎ ہمارے نزدیک اس کا حل یہ ہے کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے اس لئے پہلے
"خدا کے ظاہر ہم مثل" کو چیز ثابت کیا جائے اور پھر اس بحث میں پڑنا
چاہئے کہ وہ اس پر کیسے قادر ہے۔

۲؎ [illegible] کوئی استثنا ہوتی ہے مگر خدا کے ہر چیز پر قادر ہونے میں کوئی استثنا نہیں
[illegible] عینی شرح بخاری۔ نامعلوم خاں صاحب
[illegible] کا عقیدہ کہاں سے ہے۔

ممکن ہے کوئی اور وجود پیدا کرے گا۔ مگر اپنی کسر چھوڑ دے گا کہ اس کے بناتے وقت اسے ختمِ نبوت کا پہلو خیال میں نہیں رہے گا یہ بڑا فہم کا قصور ہے۔ رسولِ خدا جب ختمِ نبوت قائم کرنے والے ہوئے تو آپ کا مثل اسے توڑ دے گا کیسے؟ کیا پالنے پوسنے والا اور قتل کرنے والا برابر ہوتے ہیں۔

یہ ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے کہ خدا کے حق میں محال کے بھی جناب قائل ہیں اور اہلِ حق ہونے کا دعویٰ بھی ہے۔ حالانکہ یہ اہلِ حق کا نہیں بلکہ معطلہ کا عقیدہ ہے کہ خدا کو اپنی مخلوق میں تصرف کی قدرت نہیں۔ اور کوئی دوسرا غریب جب کہتا ہے کہ خدا کے لئے کچھ بھی محال نہیں تو اُسے کافر کہتے ہیں۔ خدا کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ نبی آخر الزماں جیسا اور کوئی پیدا کرلے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ختمِ نبوت کا ضابطہ نہ ٹوٹنے دے۔ چاہے یہ بات سو مرتبہ ہماری عقل میں نہ آئے۔

۲۔ گنگوہی صاحب نے لکھا ہے اور انبٹھوی صاحب کیطرف منسوب ہے کہ شیطان کا علم کائنات کو حاوی ہونا نص قرآنی سے ثابت ہے۔ اور رسولِ خدا کے علم کے متعلق ایسی کوئی نص موجود نہیں۔ عجیب بات ہے کہ شیطان کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے زیادہ علم ہے۔ سبحان اللہ: شیطان کے جس فن کا قرآن میں تذکرہ آتا ہے اسے اگر علم کا نام دیا جائے تو وہ ایک اضافی

علم ہے۔ ایسا علم موجودات کا ہر فرد دوسرے افراد سے زیادہ رکھتا ہے۔ چنانچہ پرندوں کو اُڑنے کا علم ہے اور مچھلیوں کو تیرنے کا۔ مگر ایسے علم اور فن کو اس علم سے کیا نسبت ہے جو اللہ نے اپنے رسولوں کو عنایت فرمایا ہے۔

فنوں میں سے بعض فن عیب شمار کئے جاتے ہیں جیب کاٹنا اور نقب لگانا ایک فن ہے۔ مگر اسے علم کا نام دینا تو علم کی توہین ہے۔ اسی طرح شیطان کو بھی گمراہ کرنے کا جو فن اور اس فن میں جو کمال حاصل ہے۔ وہ کسی علم کی تعریف میں نہیں آتا۔ گنگوہی صاحب نے اسے علم کا نام دیا۔ اور اس میں شیطان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نصاً فوقیت دے دی۔ خدا اُمت کے حال پر رحمت فرمائے۔ لیکن اسے کفر نہیں۔ فہم کا قصور کہنا چاہیئے۔ کفر آیت کے انکار سے ہوتا ہے۔ نہ کہ اس کا مطلب غلط لینے سے۔

۳۔ امیر احسن۔ امیر احمد سہسوانی اور مولانا نذیر حسین دہلوی تو خاص طور پر ہماری ہمدردی کے مستحق ہیں۔ خان صاحب اور ان کے فتویٰ کی تصدیق کرنے والے علماء نے ان حضرات پر بڑی زیادتی کی ہے لکھا ہے کہ وہ تھے اور اب نہیں رہے۔ ہم ان کے اقوال و احوال پیچھے بیان کر آئے ہیں۔ حالانکہ ایک جگہ کے سوا ساری کتاب میں آگے اور پیچھے کہیں ان کا نام تک موجود نہیں۔ معلوم نہیں سمندر پار بیٹھ کر مرے ہوئے لوگوں کے خلاف کفر کا فتویٰ دے کر اہلِ حرمین والوں نے کس خدا خوفی کا ثبوت دیا ہے۔ انہوں نے

لہ حسام الحرمین صفحہ ۱۰۹۔

یہ تک نہیں سوچا کہ ہم جرم کی بات اور دلیل سے عوام کو بے خبر رکھ کر فتوی کا کارنامہ انجام دے رہے ہیں۔ تو وہ ہمارے تدبر کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے۔ خان صاحب کی کتابوں سے اتنا معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ تینوں مظلوم دوسری چھ زمینوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے نبی یا خاتم الانبیاء نبی ماننے کے قائل تھے۔ اس پر خان صاحب نے ان کی دلیل اور باعث تحریر سامنے لائے بغیر ان کی اور چھ زمینوں کے مکینوں کی خبر لے ڈالی۔ شاید ایسے ہی موقعہ کے لئے کہا گیا تھا ؎

تو کار زمیں را نکو ساختی　　　　کہ با آسماں نیز پرداختی

اس ہنگامہ خیز طوفان کی اصل حقیقت فتاوی نذیریہ سے یہ سامنے آتی ہے۔

یہ حدیث کہ اس زمین کے علاوہ اور چھ زمینیں بھی ہیں۔ ان کے اسی زمین کی طرح انبیاء بھی ہیں۔ اور ان کا اسی زمین کی طرح آخری نبی ہے۔ ابن عباس کہتے ہیں۔ کہ قرآن میں بھی اس کا اشارہ پایا جاتا ہے۔ اس کے متعلق سید نذیر حسین دہلوی مرحوم نے لکھا ہے:۔

یہ حدیث صحیح ہے۔ جو اس کا اعتقاد رکھے۔ وہ مسلم صحیح الاعتقاد ہے اس کے ناقل ائمہ دین وہداۃ المسلمین ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ یہ مستدرک حاکم اور تفسیر ابن

له۔ ان میں سے ایک صاحب بڑے جوشیلے نکلے۔ انہوں نے لکھا ہے۔ کہ ایسے فرقوں کے حق میں امام غزالی نے فرمایا ہے کہ ان میں سے ایک کا قتل کرنا ہزار کافر کے قتل سے زیادہ ثواب ہے۔ (حسام الحرمین ص۱۰۲) نا معلوم امام غزالی نے ایسا کہاں کس کے حق میں فرمایا ہے۔ اور کفار کو قتل کرنا کہاں کا فرض ہے۔

جریر وغیرہ میں موجود ہے۔ اس کے راوی ابن عباس۔ ابو الضحیٰ۔ سعد عطا بن صائب۔ عطا بن یسار۔ عمر بن مرہ۔ محمد بن مثنیٰ۔ عمر بن علی۔ محمد بن جعفر۔ عبد بن سالم۔ علی بن حکیم۔ شریک۔ حاکم۔ امام سیوطی۔ ابن ابی حاتم۔ عبید بن حمید۔ ابن البوبیس۔ حافظ ابن حجر ہیں۔ فتاوی نذیریہ ص۱۶۲ اس عبارت سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ مصنف نہ تو متعدد خاتم انبیاء کے قائل ہیں۔ اور نہ مثل خاتم انبیاء کے۔ وہ صرف اس بات کے قائل ہیں۔ کہ حدیث صحیح ہے۔ آگے کوئی اس سے متعدد خاتم انبیاء کا مفہوم لیتا ہے۔ یا نہیں۔ یہ اس کے من کی بات ہے۔ اس میں روایت اور سند کے لحاظ سے کوئی سو بار کلام کر کے اسے ضعیف بتائے۔ مگر یہ تو کچھ بات نہیں۔ کہ آدمی کی بات اور ثبوت کو دکھائے۔ بغیر اسے فتوی کا شکار کیا جائے۔ کیا انصاف اور جرأت اسی کا نام ہے۔ اور کیا اس کے راوی ختم ہیں۔ مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کے متعلق خان صاحب نے لکھا ہے کہ ان کا ایک فتوی دستخطی مہر کے ساتھ موجود ہے۔ اس میں اللہ تعالی کو صاف صاف کاذب جھوٹا بتلایا گیا ہے۔ (معاذ اللہ) اس کے فوٹو علمائے حرمین کو بھیجے گئے۔ اٹھارہ برس تک اس کے رد میں رسالے اور فتوے چھپتے رہے۔ ایک مستقل رسالہ اس کے رد میں لکھ کر انہیں رجسٹری بھیجا گیا جس کی رسیدبھی واپس مل گئی۔ ایک فتوی چھپا ہوا دیکھا کہ (معاذ اللہ) خدا جھوٹا ہے جو اسے جھوٹا مانے وہ مومن صالح ہے۔ مگر احتیاط کیا کہ دوسروں کا چھپا ہوا ہے۔ یہ سب کچھ گنگوہی صاحب کی زندگی میں ہوا ہے۔ بعد میں اسے ایک

رسالہ کی تو صاحب کے پاس بھیجا۔ اسے بھی وہ کوئی جواب نہ دے سکے۔ پھر وہ واقعہ اور سوالات چھپوا کر سب بڑوں اور چھوٹوں کے ہاتھ دیا گیا۔ اور وہ چپ رہے ہے۔ یہ سب کہانی ضرورت سے زیادہ تفصیل کے ساتھ لکھ ڈالی۔ اور اس فتویٰ کو کتاب میں نقل نہیں کیا۔ جو اس قدر ہنگامہ آرائی کا باعث ہوا تھا۔ اس لئے باقی کہانی کی سچائی میں بھی کوئی اچھی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ پھر لکھا۔ کہ علمائے حرمین کی مہروں کی ضرورت نہیں۔ اس سرزمین شیطان کا داخلہ بند ہے۔ اور یہ حدیث کا فیصلہ ہے۔ مگر ہم سنتے ہیں۔ کہ اعلیٰ حضرت کے مقلد وہاں کے لوگوں کو وہابی سمجھتے ہیں۔ اور ان کے ساتھ نماز نہیں پڑھتے ہیں۔

مولانا اشرف علی تھانوی پر دوسرا الزام یہ ہے کہ انہوں نے رسولِ خدا کے علم کو چارپاؤں کے علم کے برابر ٹھہرایا ہے۔ اس پر انہیں کتے اور سؤر کے ہمسر ٹھہرایا گیا۔ ان کی اصل عبارت خان صاحب نے یہ نقل فرمائی ہے۔

"اگر بعض علوم غیبیہ مراد ہیں۔ تو اس میں حضور کی کیا تخصیص ہے۔ ایسا علم غیب تو ہر صبی مجنوں۔ بلکہ جمیع بہائم کو بھی حاصل ہے۔ اور اگر تمام علوم غیب مراد ہیں۔ تو اس کا بطلان نقل و عقل سے ثابت ہے۔"

جاہل غبی کی بات دوسری ہے۔ مگر ایک صاحب علم اور خدا سے ڈرنے والا آدمی تو اس عبارت سے کفر کا مفہوم کسی طرح نہیں نکال سکتا۔ اور رسول کے

۱؎ حسام الحرمین صفحہ ۸۴ ۲؎ ایضاً صفحہ ۸۴ ۳؎ دولت مکیہ صفحہ ۱۳ ۴؎ ایضاً صفحہ ۱۵ ۵؎ ایضاً

نادان دوست قسم کے عاشق آپ کے جن خوش آئند فضائل کے منوانے پر اصرار کرتے ہیں۔ ان کے پیش نظر یہ جواب برمحل ہے۔ اس میں ہتک و بے عزتی آنحضور کی نہیں۔ بلکہ ان نادان امتیوں کی ہے۔ جو آپ کے لئے اس طرح کے احمقانہ فضائل کا دعوےٰ کرتے ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے۔ جیسے ایک آدمی کہے کہ ہمارے باپ کو سرکار کی طرف سے "خان بہادر" کا خطاب ملا تھا۔ اس پر اسے اس کا بھائی سمجھائے۔ کہ ہمارے باپ اور بہت خوبیوں کے مالک تھے۔ یہ "خان بہادر" کا خطاب تو کوئی خوبی کی بات نہیں۔ ایسے خطابات معمولی آدمیوں اور قوم فروشوں تک کو ملتے رہے ہیں۔ اس میں ہمارے باپ کی کیا خصوصیت ہے۔ ایسا کہنے سے وہ اپنے باپ کی بے عزتی نہیں۔ بلکہ بھائی کی بے وقوفی ظاہر کرے گا۔ جو ایسے خطابات پر ریجھا۔ ایک نا سمجھ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شرف نبوت و رسالت کو ہلکا اور ناکافی جان کر آپ کے علم غیب اور نوری وجود کے لئے جھگڑا کھڑا کرتا ہے۔ تو اسے یہی سمجھانا پڑتا ہے۔ کہ جس بات کے لئے تم ہنگامہ کر رہے ہو۔ وہ کسی فضیلت اور مرتبہ کا نام نہیں۔ شامی میں ایک مقام پر لکھا ہے۔ کہ امام ابوحنیفہ کا مرتبہ اس سے بہت بلند ہے کہ غلط اور موضوع روایات سے ان کا مقام بلند کیا جائے۔ یہی بات ہمیں "شانِ رسالت" کے ان پروانوں سے کہنی چاہیئے۔ جو اپنے توہماتی ڈھکوسلوں کو قرآن سے بڑھ کر مانتے ہیں۔ اور ان سے شانِ رسالت کو چار چاند لگاتے ہیں۔ اسی بنا پر مولانا تھانوی نے اس بارہ میں جو کچھ فرمایا ہے۔ وہ سنہری

حروف سے لکھنے کے قابل ہے۔

(۵) جن لوگوں کو وہابی کہا گیا ہے۔ اُن کے پیچھے نماز جائز نہ ہونے کا ثبوت بھی خان صاحب نے خوب دیا ہے۔ فرمایا فتح القدیر میں ہے "اہلِ ہوا کے پیچھے نماز جائز نہیں۔ نامعلوم اہلِ ہوا کون ہوتے ہیں۔ اور کیوں اُن کے پیچھے نماز جائز نہیں۔ یزید۔ مروان۔ عبدالملک اور حجاج ظالم اُن جیسے لوگوں کے پیچھے صحابہ۔ ائمہ اہلِ بیت اور حضرت عبداللہ بن عمر جیسے محتاط بزرگ نماز پڑھتے رہے۔ اور کسی کو یہ فتویٰ نہ سوجھا۔ اموی حکمران منبر پر حضرت علی کی بدگوئی کرتے تھے۔ اور ان کے پیچھے اور تو اور خود حضرت حسن نماز ادا کرتے رہے۔ جب امام موصوف کی شہادت ہوئی۔ تو مروان رویا۔ لوگوں نے پوچھا۔ تم اپنے دشمن کی وفات پر کیوں روتے ہو۔ اس نے کہا کہ اُن کے اندر پہاڑ جتنا صبر اور تحمل تھا۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف جب باغیوں نے خروج کیا۔ تو وہ آپ کے قتل کے درپے ہوئے۔ مکان کا محاصرہ کر کے آپ کا کھانا پانی بند کر دیا۔ اس حالت میں آپ سے پوچھا گیا۔ کہ آپ تو امام ہیں۔ اور آپ اس حال میں ہیں۔ کیا ان باغیوں کے پیچھے نماز اور جمعہ جائز ہے۔ فرمایا "نماز تو سب سے بڑی نیکی ہے جب لوگ نیکی کرتے ہوں۔ تو ان کا ساتھ دو۔ اور جب بُرائی کریں تو ان سے کٹ جاؤ۔" آج کسی کے پیچھے نماز جائز ہونا یا نہ ہونا ایک کھیل بن گیا ہے۔ فقہ کی رُو سے اہلِ ہوا کی تعریف یہ سامنے آتی ہے۔ کہ وہ قرآن کی کافی آیات سے منہ موڑ کر بعض کو لیتے ہیں۔ اور جن کو لیتے ہیں۔ ان کا مفہوم

وہ لیتے ہیں۔ کہ آیتوں کے ساتھ آیتیں ٹکراتی نظر آتی ہیں۔ آج جنہیں وہابی کہا جاتا ہے۔ ان کے اندر ہزار میں سے شاید کوئی ایک ہو۔ جس کی تعریف اس عبارت میں ہے۔ کیونکہ لفظ وہابی کا استعمال اب اس قدر عام ہو گیا ہے۔ کہ اس کی زد سے کسی کا بچنا محال سا نظر آتا ہے۔ اور نہ ہی کسی کی زبان پکڑی جا سکتی ہے۔ کہ وہ دوسروں کو وہابی نہ کہے۔ اس کے بعد یہی صورت باقی رہتی ہے کہ ہر آدمی خود ہی امام ہو اور خود ہی مقتدی ہو۔ اور اگر وہابی اہلِ ہوا ہیں۔ تو خان صاحب کو اپنے فتوے پر مضبوطی دکھانی چاہئے۔ کیونکہ فقہ کی کسی کتاب میں موجود نہیں۔ کہ اہلِ ہوا کے ساتھ شادی بیاہ کے تعلقات ناجائز ہیں۔ اور ان کا حکم ہر معاملہ میں مرتد کے برابر ہے۔ مگر خان صاحب کا فتوےٰ ہے۔ کہ وہ مرتد ہیں۔ اور ان کے ساتھ نکاح جائز نہیں۔ حالانکہ نکاح اہلِ کتاب کی عورتوں کے ساتھ بھی جائز ہے۔

(۶) وہابی کہے جانے والوں کے ساتھ نماز جائز نہ ہونے کی دلیل بھی عجیب سی ہے۔ فرماتے ہیں۔ حدیث میں ہے۔ لا تصلوا معھم۔ ان کے ساتھ نماز نہ پڑھو۔[1] نہ معلوم عربی الفاظ کا یہ ٹکڑا کس کتاب کا ہے۔ کس کی روایت ہے۔ کن لوگوں کے حق میں ہے۔ پہلے زمانہ میں تو شاید ان الفاظ کو بلا تحقیق قبول کر لیا جاتا۔ اور خان صاحب کا زمانہ بھی ہمارے ہی جیسا تھا۔ اب اگر کسی کو موٹر یا جہاز میں نماز پڑھنی پڑ جائے۔ تو وہ بخوبی اس کی پابندی سے بچ سکتا ہے۔ اس لئے کہ کیا معلوم اس کے پاس بیٹھنے والے وہابی ہوں یا وہ انہیں وہابی کہہ دے۔ جہاز اور ریل سے باہر نماز سے بچنے کا طریقہ

[1] فتاویٰ رضویہ $\frac{۳}{۲۶۴}$

یہ ہے۔ کہ کوئی نیا مجتہد آئے۔ اور ایسی جگہ کے میلوں کا تعین کر دے۔ جہاں وہابی رہتا ہو۔ اور رضا کی شان ہے۔ ایسے مجتہد اب ٹڈی دل کی رفتار سے جنم لے رہے ہیں۔ اچھروی صاحب کا اجتہاد ہے۔ کہ جمعرات کی نیاز کھانے والوں کے بغیر سب مسلمان وہابی ہیں۔[1]

اس مسئلہ میں اعلیٰ حضرت کا اجتہاد یہ ہے۔ کہ وہابی کی نماز نماز نہیں۔[2] اس کا جماعت میں کھڑا ہونا بے نماز کے برابر ہے۔ اور بے نماز کے کھڑا ہونے سے صف ٹوٹتی ہے۔ دوسری بڑی خرابی یہ کہ وہابی آواز کے ساتھ آمین کہتے ہیں۔ اور پاس والوں کی نمازوں میں خلل آتا ہے[3] سوال یہ ہے۔ کہ اگر صف میں کوئی ستون یا درخت جیسی چیز موجود ہو تو صف کا کیا بنے گا۔ اگر نہیں ٹوٹے گی۔ تو اس کا مطلب ہوا۔ کہ ضوابط نماز میں اس قدر آدمی کی رعایت نہیں۔ جتنی لکڑی اور پتھر کی ہے۔ اور اگر آمین کی آواز سے نماز میں خلل آتا ہے۔ تو امام کی آواز سے اور حضرت کے مرید جو یا رسول اللہ کا درود اور کھڑے ہو کر سلام پڑھتے ہیں۔ اس سے کیوں نماز کی سالمیت میں فرق نہیں آتا۔ اور اُسے فرض واجب کا درجہ دیا جاتا ہے۔ اس طرح کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے۔ کہ شانِ رسالت اور عشق رسول کے ان بلند بانگ دعووں میں کتنا خلوص ہے۔ لوگ پیروی اپنی خواہشات کی کرتے ہیں۔ اور اسے نام دیتے ہیں۔ خدا اور رسول کی محبت کا۔ یعنی حدیث کی پیروی سے نماز میں خلل آتا ہے

---

[1] مقیاس الحنفیت ص ۱۶۱ ۔ [2] فتاویٰ رضویہ ص ۳/۲۶۴ [3] مقیاس الحنفیہ ص ۵۰۳ ۔ لعہ قرآن میں کفار عرب کے ان جانوروں کو قربانی اور شعائر اللہ فرما کر قربانی کے برابر ان کا ادب کرنے کا حکم فرمایا گیا ہے جو قربانی کے لئے بھیجے یا پائے جاتے تھے گویا منکرین رسالت کی قربانی قربانی تھی اور وہابی کی نماز نماز نہیں۔

موحد و غیر مقلد گروہ کو بریلوی منافق اور ان کے نماز روزہ کو منافقوں کے نماز روزہ کا نام دیتے ہیں۔ یہ ان کے دل کا سودا ہے۔ اور حدیث کے خلاف ہے۔ جہاں تک منافقوں کی نماز باجماعت کا تعلق ہے۔ اس بارہ میں قرآن کا فیصلہ ہے۔ کہ اگر وہ نمازیں مسلمانوں سے الگ کرنے کا منصوبہ بنائیں۔ تو ان کے منصوبوں کو خاک میں ملا کر انہیں مسلمانوں کے ساتھ مل کر نماز پڑھنے پر مجبور کیا جائے۔ کعب بن اشرف کا گروہ جس کا ہر فرد ٹکسالی منافق تھا۔ انہوں نے جب اپنی الگ مسجد بنا کر اس میں الگ جماعت کا اہتمام کیا۔ تو خدا نے اس کارروائی کو کفر کا اور ان کی مسجد کو مسجد ضرار کا نام دیا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر سے واپس تشریف لائے۔ تو مدینہ پہنچنے سے پہلے آپ نے اس مسجد کو جلا دینے کا حکم فرمایا اور وہ جلا دی گئی۔ یہ امر واقعہ نص ہے۔ اس بارہ میں کہ منصوص اور پرلے درجے کے منافقوں کو بھی نماز میں الگ نہ رکھا جائے۔ اور جماعت میں شامل کیا جائے۔ اس سے ان کی جمعیت ٹوٹتی ہے اور اصلاح ہوتی ہے۔ آج کے منافقوں کے بارہ میں کسی کے پاس کوئی نص موجود نہیں۔ محض نظر کا دھوکا اور احساس ذمہ داری کا فقدان ہے۔

تحریک ختم نبوت سے بھی حال کے فتویٰ بازوں نے خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ جب انہیں اپنے مخالفین کو کافر و مشرک گردانتے سے اس بنا پر منع کیا جاتا ہے۔ کہ وہ کلمہ اور نماز پڑھتے ہیں۔ تو وہ کہتے ہیں۔ کلمہ اور نماز تو قادیانی بھی پڑھتے ہیں۔ اور پھر بھی کافر ہیں۔ اس لئے کلمہ اور نماز کسی مسلمان ہونے کا

یہ ہے۔ کہ کوئی نیا مجتہد آ جائے۔ اور ایسی جگہ کے میلوں کا تعین کر دے۔ جہاں وہابی رہتا ہو۔ اور رضا کی شان ہے۔ ایسے مجتہد اب ٹڈی دل کی کی رفتار سے جنم لے رہے ہیں۔ اچھروی صاحب کا اجتہاد ہے۔ کہ جمعرات کی نیاز کھانے والوں کے بغیر سب مسلمان وہابی ہیں۔[1]

اس مسئلہ میں اعلیٰ حضرت کا اجتہاد یہ ہے۔ کہ وہابی کی نماز نماز ہی[2] نہیں۔ اس کا جماعت میں کھڑا ہونا بے نماز کے برابر ہے۔ اور بے نماز کے کھڑا ہونے سے صف ٹوٹتی ہے۔ دوسری بڑی خرابی یہ کہ وہابی آواز کے ساتھ آمین کہتے ہیں۔ اور پاس والوں کی نمازوں میں خلل آتا ہے[3] سوال یہ ہے۔ کہ اگر صف میں کوئی ستون یا درخت جیسی چیز موجود ہو تو صف کا کیا بنے گا۔ اگر نہیں ٹوٹے گی۔ تو اس کا مطلب ہوا۔ کہ ضوابط نماز میں اس قدر آدمی کی رعایت نہیں۔ جتنی لکڑی اور پتھر کی ہے۔ اور اگر آمین کی آواز سے نماز میں خلل آتا ہے۔ تو امام کی آواز سے اور حضرت کے مرید جو یا رسول اللہ کا درود اور کھڑے ہو کر سلام پڑھتے ہیں۔ اس سے کیوں نماز کی سالمیت میں فرق نہیں آتا۔ اور اُسے فرض واجب کا درجہ دیا جاتا ہے۔ اس طرح کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے۔ کہ شانِ رسالت اور عشقِ رسول کے ان بلند بانگ دعووں میں کتنا خلوص ہے۔ لوگ پیروی اپنی خواہشات کی کرتے ہیں۔ اور اسے نام دیتے ہیں۔ خدا اور رسول کی محبت کا۔ نبی حدیث کی پیروی سے نماز میں خلل آتا[4]

---

[1] مقیاس الحنفیت ص ۱۶۱/ ۲ فتاوی رضویہ ۳/ ۲۶۴ [3] مقیاس الحنفیہ ص ۵۹۳ [4] للعہ قرآن میں کفار عرب کے ان جانوروں کو قربانی اور شعائر اللہ فرما کر قربانی کے برابر ان کا ادب کرنے کا حکم فرمایا گیا ہے جو قربانی کے لئے بھیجے جاتے تھے گویا منکرین رسالت ۵۲۶ کی قربانی قربانی تھی اور وہابی کی نماز نماز نہیں۔

موحد و غیر مقلد گروہ کو بریلوی منافق اور ان کے نماز روزہ کو منافقوں کے نماز روزہ کا نام دیتے ہیں۔ یہ ان کے دل کا سودا ہے۔ اور حدیث کے خلاف ہے۔ جہاں تک منافقوں کی نماز باجماعت کا تعلق ہے۔ اس بارہ میں قرآن کا فیصلہ ہے۔ کہ اگر وہ نمازیں مسلمانوں سے الگ کرنے کا منصوبہ بنائیں۔ تو ان کے منصوبوں کو خاک میں ملا کر انہیں مسلمانوں کے ساتھ مل کر نماز پڑھنے پر مجبور کیا جائے۔ کعب بن اشرف کا گروہ جس کا ہر فرد ٹکسالی منافق تھا۔ انہوں نے جب اپنی الگ مسجد بنا کر اس میں الگ جماعت کا اہتمام کیا۔ تو خدا نے اس کارروائی کو کفر کا اور ان کی مسجد کو مسجد ضرار کا نام دیا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر سے واپس تشریف لائے۔ تو مدینہ پہنچنے سے پہلے آپ نے اس مسجد کو جلا دینے کا حکم فرمایا اور وہ جلا دی گئی۔ یہ امر واقعہ نص ہے۔ اس بارہ میں کہ منصوص اور پرلے درجے کے منافقوں کو بھی نمازیں الگ نہ رکھا جائے۔ اور جماعت میں شامل کیا جائے۔ اس سے ان کی جمعیت ٹوٹتی ہے اور اصلاح ہوتی ہے۔ آج کے منافقوں کے بارہ میں کسی کے پاس کوئی نص موجود نہیں۔ محض نظر کا دھوکا اور احساس ذمہ داری کا فقدان ہے۔

تحریک ختم نبوت سے بھی حال کے فتویٰ بازوں نے خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ جب انہیں اپنے مخالفین کو کافر و مشرک گردانے سے اس بنا پر منع کیا جاتا ہے۔ کہ وہ کلمہ اور نماز پڑھتے ہیں۔ تو وہ کہتے ہیں۔ کلمہ اور نماز تو قادیانی بھی پڑھتے ہیں۔ اور پھر بھی کافر ہیں۔ اس لئے کلمہ اور نماز کسی مسلمان ہونے کا

کوئی ثبوت نہیں۔ سچ ہے۔ اب اعتبار ہونا چاہیئے۔ تو ان کے نعرۂ رسالت لگانے اور سلام پڑھنے کا۔ کلمہ اور نماز بھی[چیزیں] تو اب قادیانیوں کے لئے رہ گئی ہیں۔ ان کا کیا اعتبار؟

یہ سخت مغالطہ ہے۔ جس میں یہ لوگ خود مبتلا ہیں اور دوسروں کو مبتلا کرتے ہیں۔ جہاں تک کلمہ شہادت کا تعلق ہے۔ قادیانیوں کا اس پر کوئی اعتقاد نہیں۔ اور اس کے ساتھ وہ نص کے بھی منکر ہیں۔ کلمہ میں جس طرح خدا کے ساتھ کسی کو خدا ماننے کی نفی ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ کسی اور کو نبی ماننے کی بھی نفی ہوتی ہے۔ یہاں نہ کوئی ظلی اور مجازی خدا ہے۔ اور نہ ظلی نبی۔ ظاہر ہے۔ کہ قادیانی ایسے کلمہ کے قائل نہیں۔ جب ان کے کلمہ اور ایمان کا اعتبار نہ رہا۔ تو اس کے بعد کسی اور چیز کا کیا اعتبار؟ کلمہ کے مفہوم میں اس طرح کا الحاد۔ نہ دیوبندیوں کے ہاں پایا جاتا ہے۔ نہ اہل حدیث اور بریلویوں کے ہاں۔ نہ وہ کسی نص کے منکر ہیں۔ سمجھ کا اختلاف ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے۔ اس لئے انہیں قادیانیوں کے ساتھ ملانے والے اپنی عاقبت خراب کئے بغیر اور کوئی کمائی نہیں کرتے۔ ان کے اختلافات نہایت لفظی اور سطحی قسم کے ہیں۔ کلی جزئی کی تفریق محض ایک ڈھونگ اور فتنہ ہے۔ خدا کو اس کی جملہ صفات میں لاشریک ماننے سے ایمان کا تقاضا پورا ہو جاتا ہے۔ اور خدا قبر اور قیامت میں اپنے فرائض کے متعلق سوال کرے گا۔ نہ کہ ان رسومات کے بارے میں۔ اس سے آگے بریلویوں کی

عبادت اور توحید سجدہ سے چل کر سجدہ پر ختم ہو جاتی ہے۔ اور دیوبندیوں کے توحید اور شرک سجدہ سے چل کر نذر و نیاز تک رہ جاتے ہیں۔ مجموعی زندگی پر نہ ان کی توحید حاوی ہے۔ اور نہ ان کی گروہ بندی میں دونوں مختلف بلکہ ایک دوسرے کے مخالف رہتے ہیں۔ اور دعوت کے دسترخوان پر سب اپنے اختلافات بھول کر ایک ہو جاتے ہیں۔ جس کی تائید نہ قرآن سے ہوتی ہے۔ اور نہ حدیث سے۔

مسائل میں مغالطہ:- اعلیٰ حضرت کے زمانہ میں بریلویوں کے مسائل انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے۔ بعد میں ان کے اور دیوبندیوں کے پردے چڑھتے چڑھتے نوبت یہ ہے۔ کہ دیوبندیوں کی شریعت جدا ہے۔ اور ان کی جدا۔ ان کے بڑے بڑے مسائل یہ ہیں۔ علم غیب اور حاضر و ناظر۔ غائبانہ استعانت اور سوا لیکار۔ نور خاک اور بشر۔ انگوٹھے چومنا۔ اقامت کے بعد جماعت کے لئے کھڑے ہونا وغیرہ وغیرہ۔ ان مسائل کے ثبوت میں آیات احادیث کا وہ اسراف روا رکھا جاتا۔ کہ توبہ ہی بھلی۔ حالانکہ جب دعوےٰ حنیفت کا ہے۔ اور یہ دعوےٰ اتنا ٹھوس ہے کہ اگر حنفیت حدیث کے خلاف پڑے۔ تو بھی حنیفت پر چلنا[۱] ہے تو پھر آیت و حدیث سے استدلال کیا معنے؟ حنفی مذہب کی کتب عقائد اور فقہائے متقدمین کے عمل سے ہر مسئلہ کا ثبوت پہنچانا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ وہاں ان نومولود مسائل کا کوئی وجود نہیں جو آپ درج کئے رہے ہیں۔ ان کی پناہ گاہ موضوع اور غیر مستند روایات ہیں۔ مگر ان کی طرف آئے۔ تو پھر آمین و رفع یدین جیسے احکام کو بھی ماننا ہوگا۔ یہ کبھی

[۱] انازہ جدا لکلام ص۲۷

اصول نہیں کہ مطلب کی روایات کو لے لیا جائے۔ اور خلاف مطلب احکام حدیث کو تقلید کی آڑ میں رد کر دیا جائے۔ یہ ہے ان کے مسائل کا مجمل جواب۔ اب انہیں نمبروار لیجئے۔

علم غیب اور غائبانہ دعا و پکار کی جس قدر آیات قرآن میں وارد ہیں۔ اور جن کے اندر غیر اللہ کی سود پکار۔ نذر نیاز اور ذبیح وغیرہ کا بیان ملتا ہے۔ انہیں بریلوی خدا اور مسلمانوں کے تعلق سے نکال کر بتوں اور بت پرستوں کے حق میں لیتے ہیں۔ اور اس طرح قرآنی احکام کے بہت بڑے حصہ کی پابندی سے صاف بچ جاتے ہیں۔ بلکہ اس طرح مسلمانوں کے لئے شرک سے بچنا لاحاصل ہو کے رہ جاتا ہے۔ مگر یہ نہیں سوچا جاتا۔ کہ آخر بت پرستوں کا خدا نے کیا بگاڑا تھا۔ یا ان کے زمانہ میں اللہ والوں کے وجود سے زمین کیوں خالی تھی۔ کیا وہ خدا اور اہل اللہ سے کٹ کر اپنے گھڑے ہوئے بتوں پر ریجھتے تھے۔ یہ بات تو نہ تھی۔ لوگ پہلے زمانے میں خدا کو بھی مانتے تھے۔ اور اولیاء اللہ کو بھی جانتے تھے۔ بات صرف اتنی تھی۔ کہ وہ اللہ والوں کے ساتھ تعلق رکھتے وقت خدا کی شریعت و ہدایت کی پرواہ نہیں کرتے تھے اگر یہی طرز ایک مسلمان کا ہو۔ تو وہ بھی انہیں کی طرح گنہگار ہوگا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا۔ کہ ایک چیز بت پرست کے لئے زہر ہو اور مسلمان کے حق شہد۔ مسلمان بھی جب خدا کے احکام سے بے نیاز ہو کر کسی جاندار یا بے جان کے ساتھ معاملہ کرے گا۔ تو وہی اس کا بت ہوگا۔ خواہ وہ کوئی پیر بزرگ ہو یا حکومت۔ کاروبار ہو یا بیوی بچے ہوں رسم و رواج ہو۔ یا قرابت اور برادری۔ بنا بریں غیر اللہ کی وفاداری سے

افادہ جد الکرامہ ص۲۷

مار رکھنے والی آیتوں کو بت پرستوں کے کھاتے میں ڈال کر ہم ان کی پابندی سے نہیں نکل سکتے۔

یہ موقف اعلےٰ حضرت کا تھا۔ اچھروی صاحب ایک نئی راہ چلے ہیں۔ انہوں نے بزرگانِ دین کے غیر اللہ ہونے سے ہی انکار کیا ہے۔ اور ہر وہ فعل جو بت پرست اپنے بتوں کے ساتھ کرتے تھے۔ انہوں نے بزرگانِ دین کے ساتھ کرنا جائز بتایا ہے[۱]۔ گیارہویں سے لے کر چڑھاوے تک ہر رسم کا کھوج انہوں نے قرآن سے لگایا ہے[۲]۔ اور غیر معروف روایات کا کوئی گوشہ نہیں چھوڑا۔ انہوں نے لکھا ہے کہ رسول غیب کو جانتے تھے۔ البتہ غیب نہیں جانتا تھا۔ جس نے شیطان کو پہلے فرشتوں کا سردار بنایا۔ اور پھر اسے[۳] دیس نکالا دیا۔

قابل غور تو یہ ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت بت پرست بھی تھے۔ اور اولیاء اللہ بھی تھے۔ بت پرستی سے خدا نے منع فرمایا ہے۔ تو اس سے مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ بتلایا جائے کہ اولیاء پرستی کا حکم اس نے کہاں فرمایا۔ اولیاء پرستی یہ ہے کہ آدمی اولیاء کے ساتھ وہ تعلقات بنائے۔ جن کا خدا نے فیصلہ نہیں دیا۔

علم غیب کے مسئلہ میں دونوں فریق دھوکہ یا عناد کا شکار ہیں۔ ان کا اختلاف نہایت لفظی اور استدلال طفلانہ ہے۔ اور کوئی فریق یہ دیکھنے کی زحمت نہیں اٹھاتا۔ کہ اہل سنت کے عقائد میں نبی کے غیب کلی کا مسئلہ کس زمانہ میں شامل تھا؟ عقیدہ تو یہ ہونا چاہیے۔ کہ آپ رسول ہیں۔ بریلوی کہتے ہیں کہ رسولِ خدا کو کائنات کے ذرہ ذرہ کا علم تھا۔ اور اس کے باوجود آپ کا علم خدا کے علم کا ایک ذرہ ہے۔ نیز خدا کا علم ذاتی ہے۔ اور آپ کا علم خدا کی طرف سے

۱ے تنفیس من الخبیث صہ ۱۲۰ ۲ے ایضاً صفحہ ۱۴۵ ۳ے ایضاً صفحہ ۵

عطائی اور خدا نے جہاں آپ کے علم کی نفی کی۔ وہ دراصل علم ذاتی کی
نفی ہے۔ یا اس کے اور وجوہ تھے۔ وہ یہ نہیں بتاتے کہ آنحضور کو کائنات
کے ذرہ ذرہ کے علم کی کیا ضرورت تھی۔ شریعت کا کون سا مسئلہ ایسے علم سے
وابستہ تھا۔ اور نہ یہ ثابت کرتے ہیں۔ کہ ذاتی علم کا اپنے یا کسی اور کے حق میں
کون قائل تھا۔ ابوجہل یا ابولہب؟ نہ یہ واضح کرتے ہیں۔ کہ آپ کے موجود
علم کی خدا نے جب کسی وجہ سے نفی فرمائی۔ تو کیا یہ سچ رہا۔ کبھی ایک موجود
چیز کے انکار کی بھی کوئی وجہ ہوتی ہے۔ البتہ آنحضور کے علم کا جو بیان قرآن
اور حدیث میں ملتا ہے۔ اس کے منکر نہ دیوبندی ہیں۔ اور نہ کوئی اور مسلمان۔
اس کے سمجھنے میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ اور ایسا اختلاف بڑے بڑے قطعی
منصوص اور عملی مسائل میں رہا ہے۔ یہ تو مسائل میں سے کوئی مسئلہ اور احکام
میں سے کوئی حکم نہیں۔ چنانچہ امام مالک کے ہاں سارے سر کا مسح فرض
ہے۔ تو امام شافعی کے ہاں سر کے دو تین بالوں کا۔ امام شافعی کے ہاں مقتدی کو قراءت
پڑھنا فرض ہے تو امام اعظم کے ہاں حرام۔ اس کے باوجود ان میں سے کسی نے
دوسرے کو کافر یا فرض و حرام کا منکر نہیں کہا۔ حالانکہ حرام کو حلال کہنے سے
کفر لازم آتا ہے۔ حرام کو فرض کہنا تو بہت دور کا معاملہ ہے۔

نبی کا خصوصی علم، علم دین ہے۔ اس کا ثبوت وہ آیت ہے۔ جو
بریلوی اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔ کہ پیغمبر غیب کے بارہ میں
"بخیل نہیں"۔ وہ کہتے ہیں۔ کہ اگر رسول خدا کو علم غیب نہ ہوتا تو اس میں آپ کے

۱؎ مقیاس حنفیت ص۱۲۲ تا ۱۳۰۔ ۲؎ ایضاً ص۴۸۷ تا ۵۱۹۔ ۳؎ ایضاً ص۴۵۔

بخل اور سخاوت کا سوال ہی نہ تھا۔ اس حد تک بات بالکل ٹھیک ہے آگے
سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ کیا بخیل وہ ہوتا ہے۔ جو اپنا خزانہ لوگوں کو دے کر جائے۔
یا وہ جو اسے اپنے ساتھ قبر میں لے جائے۔ اس کا جواب اس علم کے تعین سے ہو سکتا ہے۔
جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کو دے کر گئے تھے اور وہ ہے قرآن و
حدیث کا علم۔ اگر آپ کو ذرات و قطرات کا عالم مانا جائے۔ تو آپ معاذ اللہ
بخیل ثابت ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ علم آپ نے ہم کو دیا نہیں۔ البتہ اگر اس سے مراد
دین کا علم ہو۔ تو بات ٹھیک ہے۔ اور قرآن و سنت کا جو علم خود ہمارے
پاس موجود ہے۔ اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ وہ ہر چیز کا علم ہے۔ ان کے ایک
ایک جملہ میں علوم کے سمندر ہیں۔ پھر کہاں وہ علم و حکمت جو رسول خدا کو ارزانی
تھا۔ مگر ظاہر ہے۔ کہ ذرے ذرے کے علم سے آپ کی کوئی ضرورت اٹکی نہ تھی۔
اور نہ یہ کوئی علم ہے۔[2] آج اگر کوئی جدید ذرائع سے کام لے کر ہر آن کائنات کے ذرات
و قطرات کا حساب لگا لے۔ تو اسے عالم نہیں مانا جائے گا۔ اس لئے کہ عالم وہ
ہوتا ہے۔ جو نیکی اور برائی کا حال سمجھ کر برائی کو چھوڑتا۔ اور نیکی پر چلنا جانتا ہو۔
اور یہ خاصہ صرف نبی کا ہے۔ کسی اور کا نہیں۔ خاک اور نور اور بشر اور نور کی
بحث بھی فتنہ پردازوں کی تخلیق ہے۔ فقہا کے ہاں بلکہ پہلی امتوں میں بھی
یہ مسئلہ موجود نہ تھا۔ اب یہ خیال عقیدہ کا مقام حاصل کرتا جا رہا ہے کہ
رسول خدا کو نرا رسول خدا ماننا کافی نہیں۔ جب تک کہ آپ کی صفات کو نہ مانا جائے۔
آگے آپ کی صفات میں کوئی جو کچھ اضافہ کرتا جائے۔ یہ اس کے دل کی بات ہے
کسی کے ہاں آپ کی صفت یہ تھی۔ کہ آپ کا سایہ نہ تھا۔ کسی کے ہاں یہ کہ آپ کے

۱؎ مقیاس حنفیت ص۱۴۴ مگر آپ کی دعاؤں میں تو ہے کہ آپ بے فائدہ علم سے خدا کی پناہ
مانگتے تھے

پاخانہ نہ تھا۔ کسی کے ہاں یہ کہ آپ مٹی سے نہ تھے۔[1] مگر سوچیئے کہ خدا کی صفات کی اہمیت تو بہرحال ہے کہ اس کی ذات ہمارے ادراک سے باہر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بذاتِ خود اس دنیا میں تشریف لائے اور آپ کی زندگی کا ریکارڈ اب بھی موجود ہے تو آپ کی صفات کو عقیدہ کے طور پر منوانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اوّل اس لئے کہ اگر آدمی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے کہ سورج گول ہے۔ اگر ہم کہیں کہ اسے چار کونوں والا مانو۔ تو خواہ اسے لاکھ دوزخ کے عذاب سے ڈرا جائے۔ وہ کبھی ایسا عقیدہ قبول نہیں کرے گا۔ جسے اس کا مشاہدہ باطل کرتا ہے۔ دوم اس لئے کہ اگر ہم اسے کہیں کہ سورج کو گول مانو۔ اور عقیدہ کے طور پر مانو۔ تو ایسے عقیدہ کی ضرورت و معقولیت کا وہ کبھی قائل نہ ہوگا۔

شامی میں ہے کہ جن باتوں کا قبر اور قیامت میں سوال نہیں ہوگا۔ ان کے بارے میں بحث کرنا بیکار ہے۔ اور قبر میں کیا سوال ہوگا۔ حدیث میں ہے۔ کہ صرف تین باتوں کا۔ خدا اور رسول۔ اور دین۔ مردہ کے سامنے رسولِ خدا کو حاضر کر کے اس سے سوال کیا جائے گا۔ کہ اس آدمی کے متعلق تمہاری کیا رائے تھی؟ اگر اس نے جواب میں کہا۔ کہ یہ اللہ کا رسول ہے۔ تو نجات پائے گا۔ ورنہ نہیں۔ یہ نہیں کہ جو کہے گا۔ یہ نور ہے۔ اس کی نجات ہوگی۔ اب ہم سن رہے ہیں۔ کہ جس بات کا اقرار قبر میں لیا جائے گا۔ وہ کافی نہیں یعنی حضرت عیلےٰ کو خدا کا بندہ اور رسول مانا جائے تو کافی نہیں۔ خدا یا خدا کا بیٹا مانا جائے۔ تو

[1] لیکن اس سے ہماری کون سی مشکل حل ہوئی کہ آپ یہ تھے اور وہ نہ تھے۔

ان کی شان بڑھتی ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ رسول خدا کو بشر کہنے سے آپ کی بے ادبی ہوتی ہے۔ نور کہنے میں آپ کا ادب ہے۔ اور خاک کہنے میں بے ادبی۔ یہ نرا شیطانی قیاس ہے۔ اور اگر آپ کے زمانہ والوں کے دماغ میں یہ بات آتی کہ ہم جس مخلوق سے ہیں۔ اس کی نسبت سے ہمارے رسول صاحب کی بے ادبی اور بے عزتی ہوتی ہے۔ تو شاید ہی کوئی آپ پر ایمان لاتا۔ سوال یہ ہے کہ اگر مٹی بری چیز تھی۔ تو حضرت آدم کو کیوں اس سے پیدا فرمایا گیا۔ کیا وہ کسی شمار میں نہ تھے۔ کہ فرشتوں کا سجدہ ہو تو بھی ہمارے حضرت کے لئے ہو نود ہوں تو بھی آپ کی بے ادبی سے ہو۔ یہ سب اوہام نصوص قرآنی کے خلاف ہیں۔ اور ان سے یہ ماننا لازم آتا ہے کہ شیطان حضرت آدم کی جو بھی بے ادبی کرتا اتنا مجرم نہ ہوتا۔ اور انہیں خاکی وجود کہنے سے کچھ ہرج نہیں۔ گویا خاک اور نور کا مسئلہ دو طرفہ شر ہے۔ ایک طرف یہ رسول خدا کی مصنوعی عزت ہے۔ اور دوسری طرف اس سے حضرت آدم اور تمام انبیاء کی توہین ہوتی ہے۔

انگوٹھے چومنے کا مسئلہ دو طریق سے آیا ہے۔ ایک حضرت ابو بکر سے موضوع اور بے اصل روایت کے ذریعہ دوسرے ایک غیر مشہور انجیل سے[2] جس میں ہے کہ یہ حضرت آدم کا عمل تھا۔ وہ غیر مشہور اس لئے ہے۔ کہ اگر اسے کسی درجہ میں مانا جاتا۔ تو آج دنیا میں صرف اسلام ہوتا۔ عیسائیت نہ ہوتی۔ ان کو چاہئے۔ کہ مسلمانوں کو انگوٹھے چومنے سے پہلے اس انجیل کے ذریعہ عیسائیوں

[1] حسام الحرمین ص۲ [2] مقیاس الحنفیت ص۲۰۳

کو مسلمان بنائیں۔ تاکہ اس سب سے بڑے فرض کی سند کا حال بھی کھل جائے کچھ ایسا ہی ان فرنوں بعض اہل شیعہ کو بڑے بڑے پادریوں اور مشنریوں کے ذریعہ انکشاف ہوا ہے۔ کہ حضرت نوح کی کشتی پہ پنجتن کے نام لکھے تھے۔ اور حضرت نوح نے انہیں پکارا تھا۔ بدقسمتی یہ ہے کہ اس وقت ان مسائل کو محض فرقی جذبہ اور گروہی شعار کے تحت اختیار کیا جاتا ہے۔ اور اس طرح ایک بے اصل بات فرض سے بڑھ کر اہم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ضاد کو ظ کے مشابہ پڑھنا وہابیوں کا طرز عمل ٹھہرا کر اعلیٰ حضرت نے اس پر ایک رسالہ تصنیف کر ڈالا۔ کہ یہ حرام ہے۔ اور اس سے نماز باطل ہو جاتی ہے۔ اور اس لئے کہ یہ وہابیوں کا طریقہ ہے۔ ظاہر ہے کہ جس عمل کا محرک یہ جذبہ ہو۔ اس کی خدا کے ہاں کیا قدر ہو سکتی ہے۔ پھر انگوٹھے چومنے کا تو کوئی جواز ہی نہیں۔ مولانا عبدالحی لکھنوی نے سعایہ میں اسے بدترین بدعت ٹھہرایا ہے۔

اقامت کے بعد جماعت کے لئے اٹھنا بھی اب فرض بنتا جا رہا ہے۔ اور اعلیٰ حضرت کا اس پر بھی ایک رسالہ موجود ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو ایک موقعہ پر فرمایا تھا۔ کہ مجھے آتے ہوئے دیکھنے سے پہلے تم جماعت کے لئے نہ اٹھا کرو۔ کسی حدیث میں یہ موجود نہیں کہ اقامت کے حی الصلوٰۃ ہونے سے پہلے نہ اٹھا کرو۔ یہ باب فقہ کی کتابوں میں پائی جاتی ہے۔ اور ان میں ہے کہ حی علی الصلوٰۃ کہنے کے بعد اٹھنا

ــــــــــــــــــــــــ

۱؎ افازہ جد الکرامہ ص۱۸ ۲؎ سبل اصفیا ص۱۵

منع ہے۔ نہ کہ پہلے۔ اور یہ بھی کہ پہلے اٹھ کھڑے ہونا۔ خواہ مخواہ کی مشقت ہے۔ اور یہ بھی کہ پہلے اٹھنے میں ۱؎ حرج نہیں۔

یہ بات عقلاً بھی درست معلوم ہوتی ہے۔ جیسے نماز جمعہ کے اذان سنتے ہی دوڑ کر جانے کا حکم صادر فرمایا گیا ہے۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں۔ کہ پہلے جانا گناہ ہے۔ گناہ نہ جانا ہے۔ اور یہ کر کے جانا۔ مگر فقہ کی جن کی کتابوں میں حی علی الصلوٰۃ سے پہلے کھڑے ہونا مکروہ بتایا گیا ہے۔ وہ حدیث کے موافق معلوم نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ حدیث سے واضح ہے۔ کہ آنحضور کو حجرہ سے مسجد کو آتے ہوئے دیکھ کر صحابہ کو کھڑے ہو جانے کا حکم تھا۔ وہ کھڑے ہو جاتے۔ اور پھر اقامت شروع ہوتی تھی جس کا مطلب یہ ہے کہ اقامت شروع ہونے سے پہلے اٹھنے کا حکم ہے۔ کھڑے ہو کر صفیں درست کی جائیں۔ قد قامت الصلوٰۃ پر امام تحریمہ باندھے۔ اور ساتھ ہی مقتدی اس کی تکبیر اولیٰ میں شامل ہو جائے۔ لیکن اگر نمازی حی علی الصلاۃ پر کھڑے ہونا شروع کریں۔ تو وہ امام کے قرأت شروع کرنے سے پہلے کسی طرح جماعت میں شامل نہیں ہو سکتے۔ مگر یہ لوگ امتیازی حیثیت بنانے کے لئے اس عمل کو لئے ہیں۔ جو حدیث کے اور آدھی سے زیادہ فقہ کے بھی خلاف ہے۔ اور فقہ کی عبارات کو وہ معنے پہناتے ہیں۔ جن کا چلن کسی بازار میں نہیں۔ مثلاً طحطاوی کی ایک عبارت ہے۔

ــــــــــــــــــــــــ

۱؎۔ افازہ جد الکرامہ ص۲۴

"ظاہر تو یہی ہے کہ حی علی الصلوٰۃ کے بعد کھڑا ہونا منع ہے۔ نہ کہ اس سے پہلے۔ اس لئے اگر پہلے کھڑا ہو جائے۔ تو اس سے کچھ ہرج نہیں۔"

انہوں نے اس کا مطلب یہ لیا۔ کہ پہلے اٹھنا مکروہ ہے۔ کیونکہ "ہرج نہیں کا مطلب ہوتا ہے۔ کہ ایسا کرنا مکروہ ہے"۔ خدا خواہشات کی بندگی سے بچائے۔ عبادت پکار پکار کر کہہ رہی ہے۔ کہ پہلے اٹھنا منع نہیں۔ بعد میں اٹھنا منع ہے۔ اور یہ کہتے ہیں کہ پہلے اٹھنا مکروہ ہے۔ پھر اس انوکھے استدلال پر کتابوں کے حوالے نکالے گئے ہیں۔

مغالطہ کی انتہا:۔ وہ کہتے ہیں۔ کہ جو کچھ بزرگوں سے ہوتا چلا آیا ہے۔ اسے جاری رہنا چاہئے۔ جو کام مسلمان کر رہا ہو۔ وہ چونکہ مسلمان کا کام ہے۔ اس لئے حسن ظن سے جائز سمجھنا چاہئے۔ اور اس وجہ سے کہ امام اعظم کا ارشاد ہے۔ اور حدیث کا مطلب ہے۔ کہ کلمہ پڑھنے والے اور اہل قبلہ کو کافر کہنا جائز نہیں۔ خواہ وہ جو گناہ کر گذرے۔ یہ مانا کہ شرک کے فتوے نہ لگانا چاہئے اور نہ حدیث میں یہی ہے۔ کہ جو ہمارے ساتھ یا ہمارے جیسی نماز پڑھتا ہو۔ ہمارے ہی قبلہ کا رخ کرتا ہو اور ہمارا ہی ذبح کھاتا ہو۔ وہ مسلمان ہے۔ اللہ اور رسول کے ذمہ میں ہے۔ مگر اعلیٰ حضرت یہی رعایت دوسروں کو کیوں نہیں دیتے مخالفین پر یلغار کرتے وقت جناب کو فقہ کا یہ مسئلہ اور حدیث کا یہ حکم یاد سے

۱؎ - انا نہ جدالکرامہ صفحہ ۲۹ ۲؎ فتاوی رضویہ ۳ / ۳۱-۱۳۰ کوکب شہابیہ صفحہ ۱۰-۵۳
۳؎ ہم پیچھے قرآن سے بتا آئے ہیں۔ کہ کسی کو جماعت سے الگ نہ رہنے دیا جائے۔

اتر جاتا ہے۔ چنانچہ آپ ان کے متعلق کہتے ہیں۔ کہ ہم اسے کافر نہیں کہیں گے۔ جس کے اندر کفر کی کوئی نشانی اور علامت نہ پائی جائے۔ مثلاً (جبریل یا صحابہ) اس سے حدیث اور فقہ کے مسئلہ کا جواب ہو جاتا ہے۔ وہابیوں کے حق میں وہ یہ ظن کیوں نہیں کرتے۔ کہ وہ توحید اور سنت کے جذبہ سے عمل کرتے ہیں۔ پھر اگر دارومدار کفر کی نشانی پر تھا۔ تو حدیث میں ہونا چاہئے تھا۔ کہ جس کے اندر تم کفر کی کوئی نشانی نہ سمجھو۔ اسے مسلمان کہو۔ ان تین باتوں کے گنوانے کا مقصد یہی تو ہو سکتا ہے۔ کہ جو آدمی دین اسلام کے ایسے بڑے بڑے شعائر سے منہ موڑنے والا ہو۔ اور گنہگار ہو۔ اسے مسلمانوں کے زمرہ میں شامل کر کے اصلاح کے دائرہ میں رکھا جائے۔ کیا وہابی ان شعائر کے منکر ہیں؟

بزرگوں سے کیا کچھ ہوتا چلا آیا۔ اور بزرگ کون ہیں۔ اس میں بڑا اجتہاد ہے۔ قرآن کہتا ہے۔ کہ بزرگ وہ ہے۔ جو اسلام کا پابند ہے۔ اب اس ترتیب کو الٹ کر یہ سمجھا جاتا ہے۔ کہ اسلام وہ ہے۔ جو بزرگ بتائیں اور بزرگ وہ ہے۔ جسے بزرگ سمجھ لیا جائے۔ غور کیجئے! اس دلیل میں کیا وزن ہے۔ اور قرآن کی کس آیت میں ہے۔ کہ بزرگوں کی باتوں کو شریعت کے درجہ میں مان کر عمل کیا جائے۔

ہماری پوزیشن یہ ہے۔ کہ اگر ہم اپنی نجات کا غرور کریں۔ تو سخت دھوکہ میں رہیں گے۔ بعد والے اگر ہمیں بزرگ مان بیٹھے۔ تو ظاہر ہے کہ وہ ہم سے

۱؎ حسام الحرمین صفحہ ۳۰

بھی زیادہ برے ہوں گے۔ اُن کی عقیدت کی بدولت ہم بزرگ ہونے سے
تو رہے۔ اسی طرح ہر زمانہ میں لوگ اچھے اور برے رہے ہیں۔ اور
ضروری نہیں کہ پہلے گذرنے والے جس آدمی کو بزرگ مانا جائے۔ وہ بزرگ
ہی ہو۔ اور اگر خدا کے حضور بزرگوں کا یہی مقام ہوتا۔ تو خدا انبیاء اور
کتابیں کبھی نہ بھیجتا۔ یہ بزرگ آج ہمارے ہی حصے میں نہیں آئے۔ ہر
زمانہ میں رہے ہیں۔ اور خدا نے ہدایت کا معیار اپنے رسولوں اور
کتابوں کو ٹھہرایا ہے۔ یہ دنیا جہاں جھوٹے نبی اپنی نبوت کا سلسلہ لوگوں سے
منوا لیتے ہیں۔ کیا آپ کا یہ خیال ہے۔ کہ بناوٹی بزرگ یہاں کوئی نہیں۔
یہ انہیں نام کے بزرگوں کی کرامت ہے۔ کہ آج میلے ٹھیلے، چراغ چڑھاوے،
بیداری اور خواب کے قصے سب کچھ شریعت کے اجزا بنتے چلے جا رہے
ہیں۔ ایسے ہی بزرگوں پر مولانا روم نے لعنت کی ہے۔

اہلِ حدیث

اہل حدیث کا کہنا ہے۔ کہ کسی امام کی پیروی کرنا حرام اور شرک میں داخل
ہے۔ انہوں نے گروہی و امتیازی مسائل میں شدت کا اور اپنے علم و فہم
پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کا جو طرز اختیار کر رکھا ہے۔ وہ حد درجہ افسوسناک
ہے تقلید کو یہ حرام اور حنفی شافعی ہونے کو شرک بتاتے ہیں۔ بیس تراویح ان کے
ہاں بدعت ہے۔ حالانکہ ان کے پیشوا شاہ ولی اللہ اپنے تمام اجتہادات
کے باوجود حنفی تھے۔ اور شاہ اسمٰعیل شہید حنفی پیر کے مرید تھے۔

ظاہر پرستی اور عوام بیزاری میں اہلحدیث اپنے ابنائے زمانہ میں کسی
طرح پیچھے نہیں۔ روایات سے امت کی یکسوئی کو غارت کر نئے نئے مسائل نکالنے اور ان پر اڑنے
میں ان کا یہ حال ہے کہ وہ اپنی رائے کے خلاف جانے والے ہر عمل
کو بدعت گردانے بغیر نہیں رہنے چاہتے۔ وہ حقیقت میں بدعت ہو یا
نہ ہو۔ چنانچہ آٹھ سے زیادہ تراویح کو وہ بدعت کہتے ہیں۔ پھر ساری
بدعتی ان کے ہاں جہاد و قتال کے قابل مجرم ہوتا ہے۔ اس بارہ میں
راقم کا ذاتی مشاہدہ یہ ہے۔ کہ ایک جگہ کے اہلحدیث بیس تراویح کو
بدعت ثابت کرنے کے لئے حنفیوں کے ساتھ مناظرہ کی تیاری کر رہے
تھے۔ میں نے جا کر ان کے بزرگ سے عرض کیا۔ کہ حضرت یہ جو ملک
میں شراب خانے ناچ گھر۔ اور سینما قانونی قوت کے ساتھ چل رہے
ہیں۔ جن کے اندر عین جمعہ کے موقعہ پر خاص شو دکھائے جاتے ہیں کیا
یہ سب بدعتیں نہیں۔ اور بدعت صرف تراویح ہی میں رہ گئی ہے؟
بڑے رعب کے ساتھ فرمانے لگے۔ کہ ہاں وہ بدعتیں ہیں۔ اور ان
کے خلاف ہمارا جہاد یہ ہے۔ کہ ہم انہیں دل سے برا سمجھتے ہیں۔ اقبال
مرحوم نے شاید ایسے ہی موقعہ کے لئے کہا تھا ع

اسلام سے محاسبہ یورپ سے درگذر

بدعت کی یہ تعریف اگر پہلے زمانہ میں کہیں رواج پاتی تو ہر فقیہ
اور محدث دوسروں کو بدعتی ٹھہراتا اور اگر جہاد کی یہ تقسیم عمل میں آتی تو

؎ بعض بزرگ ایسی باتوں کے جواب میں کہتے ہیں۔ کہ تم جانتے کیا نہیں۔

صحابۂ رسول سب آپس میں لڑمرتے اور باہر والی کافر حکومتوں کے مقابلہ میں کبھی نہ نکلتے۔ انہیں صرف اپنے دل میں بُرا سمجھتے رہتے۔

تراویح کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ یہ آٹھ ہیں۔ بیس نہیں یعنی اختلاف برائے اختلاف۔ اگر اختلاف اس بات کا ہوتا کہ وہ آٹھ ہیں چار نہیں۔ تو اس مسئلہ میں لڑائی لڑنے کے کوئی معنے ہوتے۔ موجودہ صورتِ حال

بقیہ حاشیہ از صفحہ سابق۔ کہ بدعت کیا چیز ہوتی ہے۔ اس طرح کے کام تو گناہ کے کام ہیں۔ انہیں بدعت کون کہتا ہے۔ یعنی تپدق یا قولنج بیماری ہے۔ زہر نہیں۔ چلئے سینما ہاوس اور کنجر خانے قائم کرنا بھی گناہ اور بدعت کرنا بھی گناہ۔ پھر بدعتیوں اور بدمعاشوں کے خلاف یکساں لڑائی نہیں تمہارا تراویح پڑھنے والوں کو کاٹ کھانے کی کیا وجہ ہے۔ بدعت کے معنی ہیں۔ ایک ایسا کام جو کسی دینی دلیل کے بغیر کیا جائے۔ اس اصول کے تحت اگر آپ سوچیں۔ تو زنا کے اڈے۔ شراب خانے۔ بدمعاشی کی تربیت کے مراکز (سینما) قائم کرنا بدعت ہے نہ کہ بیس تراویح۔ کیونکہ ان کاموں کے لئے کوئی شرعی دلیل موجود نہیں۔ جہاں تک ان کے گناہ ہونے کا تعلق ہے۔ اس میں بڑا مغالطہ ہے۔ گناہ قتل وشو بھی ہے اور کھڑے ہو کر پیشاب کرنا بھی۔ اور سب سے خطرناک قسم کی بدعت یہ ہے کہ پہلی قسم کے گناہوں کو دوسری طرف کے گناہ کے برابر سمجھا جائے۔ اُن کا ارتکاب کرنے والے دراصل اسی دھوکہ میں مبتلا ہو کر اور انہیں ہلکا جان کر اُن کے مرتکب ہوتے ہیں۔ بخلاف اس کے بیس تراویح والوں کے ہاں تو شرعی دلیل موجود ہے چاہے وہ اہلحدیث کے ہاں کمزور سہی۔

میں تو ان کی لڑائی ایسی ہے جیسے اگر کوئی آٹھ روپیہ زکاۃ کی جگہ بیس روپے دیدے۔ تو اس سے اس لئے لڑا جائے کہ تم بارہ روپے زیادہ کیوں خدا کی راہ میں خرچ کر رہے ہو۔ وہ کہتے ہیں۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آٹھ تراویح پڑھی ہیں۔ حالانکہ یہ قطعی جھوٹ اور دھوکہ ہے آنحضور جو آٹھ رکعت پڑھا کرتے تھے۔ وہ تمام سال پڑھا کرتے تھے۔ یہاں جھگڑا صرف رمضان کی نماز کا ہے۔ جو آپ نے کبھی پڑھی نہیں۔ صرف لوگوں کو اس کی ترغیب دلائی۔ چنانچہ صحابہ آپ کی شرکت کے بغیر خود ہی پڑھتے رہے آپ نے فرمایا تھا۔ کہ اگر میں تمہارے ساتھ مل کر

لے۔ بعض ایک روایات میں آتا ہے کہ آپ نے تین روز آٹھ رکعت پڑھی تھیں۔ مگر یہ روایت اس قدر کمزور ہے۔ جیسے یہ کہ آپ نے بیس رکعت پڑھی تھیں کیونکہ ضعف صرف سند سے ہی نہیں ہوتا۔ اس سے بھی ہوتا ہے۔ ایک حدیث کا متن تعامل اور عرف عام کے خلاف ہو۔ آٹھ رکعت والی روایت کی یہی شان ہے۔ اسے اگر صحیح کہا جائے تو لازم آتا ہے کہ آٹھ رکعت صرف تین دن پڑھی جائیں۔ حالانکہ اس کا قائل کوئی بھی نہیں۔ اس طرح یہ اہلحدیث کی تائید بھی نہیں کرتی۔ اور بیس رکعت والی حدیث کی تائید میں مسلمانوں کے سوادِ اعظم کا آج تک عمل ہے۔ اور یہی وجہ ہے اس کی سند کے ضعیف ہونے کی وجوہات دھوپ اور پانی کی طرح عام ہو چکی ہیں۔ اس کی روایت کرنے کا اہتمام کم ہی کیا جاتا ہے۔ اس لئے جب کوئی ناقابل اعتماد آدمی اسے بیان کرتا ہے تو اسے رد کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ آٹھ رکعت والی روایت کی سند کا حال بھی کچھ زیادہ اچھا نہیں۔ ملاحظہ ہو (النور صحیح فی عدد تراویح)

پڑھیں تو یہ تم پر فرض ہو جائے گی۔ اس پر صحابہؓ گروہ گروہ اکیلے اکیلے
تراویح ادا کرتے رہے۔ یہاں تک کہ حضرت عمرؓ نے انہیں ایک امام
کی جماعت میں ادا کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ جسے سب نے قبول
کیا۔ وہ بیس رکعت پڑھتے رہے[1]

اس مقدمہ سے تین باتیں واضح ہوئیں۔ ایک یہ کہ نماز تراویح نفل
نماز ہے۔ فرض نہیں۔ دوم یہ کہ یہ نماز تہجد سے الگ ہے۔ سوم یہ کہ بیس رکعت
صحابہ کا متفقہ عمل ہے۔ ان تینوں باتوں پر غور کرنے سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔
کہ ان میں کوئی بات بھی لڑائی لڑنے کی نہیں۔

پہلی بات پر غور کیجیے! جب تراویح نفل نماز ہے تو کوئی آٹھ پڑھے یا
بیس پڑھے یا نہ پڑھے مواخذہ کے قابل نہیں۔ لڑائی تو ان لوگوں سے
ہونی چاہیے۔ جو فرائض کو چھوڑے بیٹھے ہیں۔ نہ دن کو روزے رکھتے ہیں۔
اور نہ رات کو تراویح پڑھتے ہیں۔ دوسری بات پر غور کیجیے۔ جب نماز تہجد
ہمیشہ سے اور فرضیت رمضان سے بھی بہت پہلے سے آٹھ رکعت چلی آرہی
ہے۔ تو تراویح کو اس کے ساتھ ہم عدد اور گڈمڈ کر کے دونوں کے مصالح
کو غارت کرنا کیا ضروری ہے۔ اس طرح دونوں کی اہمیت ختم ہوتی ہے۔
جو آدمی کبھی تہجد نہ پڑھے۔ اس کے لئے بیس تراویح ہی معقول ہو سکتی ہیں۔
نہ کہ آٹھ۔ اور جو بے نماز ہو اور صرف رمضان میں نماز پڑھے اسے تو بیس
سے بڑھ کر چھبیس تراویح پڑھنی چاہئیں۔ تاکہ اس کی فوت شدہ نمازوں کا کفارہ ہو
اب تیسری بات پر غور کیجیے۔ قرآن کے کئی ایک مقامات پر موجود ہے

[1] موطا کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے آٹھ تراویح کا حکم فرمایا تھا مگر خود امام مالکؒ کا مذہب اسکے خلاف ہے
اور ابن عبدالبر مالکی کی تحقیق ہے کہ امام مالک کو اس روایت میں مغالطہ ہوا ہے۔ (التوضیح)

اور حدیث میں تو یہ مضمون عام ہے۔ کہ تمام مسلمان کسی وقت بھی غلطی پر
جمع نہیں ہوتے۔ سوال یہ ہے۔ کہ اگر بیس تراویح کے لئے کوئی دلیل
موجود نہ تھی۔ تو صحابہؓ نے ان پر کیسے اجماع و اتفاق قائم کر لیا۔ پاک و
ہند اہل حدیث کے زمانہ تاریخ سے پہلے کوئی ایک آدمی بھی تو ایسا پایا گیا
ہوتا۔ جو آٹھ تراویح کا قائل اور عامل ہوتا۔

اس کے علاوہ نوافل کا باب وسیع ہے۔ نفل بڑھانے یا نئے قائم
کرنے میں بدعت راہ نہیں پاتی۔ حضرت بلالؓ کی نوافل وضو والی حدیث
اور کئی ایک اور احادیث اس پر شاہد ہیں۔

طلاق کے مسئلہ میں ان "متبعین سنت" نے وہ اودھم مچایا ہے۔
کہ ان پر مفتی ماجن کی تعریف صادق آتی ہے۔ اسے بھی یہ اپنی جماعتی ترقی
کا سامان بنا رہے ہیں۔ ایک آدمی اپنی بیوی کو تین طلاق دے کر جب
چاہتا ہے۔ (نہیں بلکہ) جب وہ ان کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ تو وہ اسے
دوبارہ ڈالی ہوئی تھوک چٹائے بغیر نہیں رہتے۔ اور کہتے ہیں۔ کہ جاؤ اور
اپنی بیوی کو اطمینان کے ساتھ آباد کرو۔ پرواہ نہیں اگر عوام کے ہاں یہ زناکاری

چاروں مذاہب کے فقہاء اور اہل ظاہر کے بڑے علماء کا متفقہ مسلک
ہے۔ کہ تین طلاقوں کے بعد نکاح باقی نہیں رہتا۔ امام شافعی اور ابن
حزم تو یہاں تک کہتے ہیں۔ کہ تین طلاق ایک ہی دفعہ دے ڈالنا مکروہ
بھی نہیں۔ اور وہ ہر صورت میں واقع ہو جاتی ہے۔ صرف ابن تیمیہ اور
ان کے شاگرد ابن قیم اس کے خلاف گئے ہیں۔ مگر انہوں نے نہ کبھی تین
طلاق والوں کو بے دین کہا۔ اور نہ اس کے مخالفین کو کہا۔ کہ ان کا دین قائم
ہو گیا۔ عقلی دلائل پر وہ کہتے ہیں۔ کہ سو مرتبہ سبحان اللہ کہنے کے لئے ایسا
کبھی نہیں ہوا۔ کہ آدمی ایک دفعہ کہے۔ کہ میں نے سو مرتبہ سبحان اللہ کہا۔ بلکہ
اسے سو مرتبہ ہی سبحان اللہ کہنا پڑتا ہے۔ معاملات میں یہ دلیل بہت

کمزور ہے۔ پھر اس سے لازم آتا ہے۔ کہ اگر آدمی ایک مجلس میں ایک طلاق دوسری طلاق اور تیسری طلاق کہہ کر طلاق دے۔ تو وہ واقع ہو جائے۔ حالانکہ وہ اس کے بھی قائل نہیں۔ معاملات میں جب ایک آدمی مثلاً اقرار کرے کہ میرے ذمہ زید کا ایک ہزار روپیہ قرضہ ہے۔ تو اس پر ہزار روپیہ ادا کرنا لازم ہو جاتا ہے۔ بغیر اس کے کہ وہ ایک سے لے کر ہزار تک کی گنتی کرے۔ رہا سبحان اللہ کا معاملہ تو وہ چونکہ اللہ کا ذکر ہے۔ اس لئے جتنی مرتبہ زبان پر لایا جائے بہتر ہے ورنہ کسی کو ایک ہزار لعنت کہنے سے آدمی ہزار لعنت کا گناہ پاتا ہے۔ یہی حکم بہت سے غلاموں کو ایک دفعہ آزاد کرنے کا ہے۔

اہلحدیث کہتے ہیں۔ کہ رسولِ خدا کے زمانے میں تین طلاق کو ایک ٹھہرایا جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں تین کو تین قرار دیا۔

یہ روایت ابن عباسؓ سے صحیح مسلم میں موجود ہے۔ علماء نے اس کے مختلف جوابات دیئے ہیں۔ مگر بات بنتے ہیں نہیں آتی۔ راقم کے نزدیک اس میں چار طرح کی کمزوریاں موجود ہیں۔ ایک یہ کہ یہ خبر آحاد سے ہے دوسری یہ کہ شاذ ہے تیسری یہ کہ قرآن کے صریح طور پر خلاف ہے چوتھی یہ کہ اس میں شیعی ذہن کارفرما ہے۔ اور اسی پر اب بھی اہل شیعہ کا عمل ہے۔

پہلی بات کا ثبوت یہ ہے۔ کہ ابن عباس کے بغیر اس کا اور کوئی راوی نہیں۔ اور اس کے واحد راوی کا اپنا مذہب بھی اس کے موافق نہیں۔ یہ بات اس کے موضوع ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ اور شاہ شاہ ولی اللہ کے ارشاد کے مطابق وہ ہوتی ہے۔ جو چاروں مذاہب کے عمل کے خلاف ہو۔ عقلاً یہ بات محال ہے۔ کہ ایک صحیح حدیث موجود ہو۔ اور چاروں مذاہب کے امام اس سے ناواقف رہیں۔ یا اس کے خلاف عمل کریں۔

شاہ صاحب کے اس استنباط سے ایک نیا اصول ہمارے سامنے آتا

ہے۔ وہ یہ کہ خبر احادہ کی حدیث جب اُمت کے عمل میں آجائے۔ تو اُسے مشہور اور متواتر حدیث کا مقام مل جاتا ہے۔ اور ایک مشہور حدیث کی تائید میں جب مسلمانوں کا عمل موجود نہ ہو۔ تو اُس کا مرتبہ خبر واحد سے زیادہ نہیں۔ چنانچہ روزہ کا کفارہ۔ خون بہا کی مقدار۔ قسامت کا قتل۔ چوری کی سزا کا تعین۔ لعان سے میاں بیوی کی تفریق۔ زکوٰۃ کا نصاب۔ زخموں کا ہرجانہ و جرمانہ وغیرہ۔ ان سب میں خبر آحاد ہی وارد ہیں۔ مگر اُمت کے متواتر عمل نے انہیں صحیح منوا لیا۔ بالکل اسی طرح قرآن کے مفہوم کے لئے بھی اُمت کا عمل معیار ہے۔ اس اصول پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے۔ کہ جن مسائل کو لے کر اہل حدیث یا دوسرے گروہ آج اپنی امتیازی شان قائم کئے ہوئے ہیں۔ ان کا بڑا حصہ بے اصل ہے۔ اہل حدیث کہتے ہیں۔ کہ حدیث کا ایک حکم ایسا بھی تو ہو سکتا ہے۔ جو تنہا ایک ہی صحابی کے علم میں آیا ہو۔ اور دوسرے صحابہؓ اس سے ناواقف رہے ہوں۔ اور مذاہب کے امام بھی اُسے نہ پا سکے ہوں۔ یہ بات اُن کی روائت پرستی کا پتہ دیتی ہے۔ اس بنا پر قرآن کی بھی تو ایک آیت ایسی ہو سکتی ہے۔ جو تنہا ایک ہی صحابی کے علم میں آئی ہو۔ اور دوسرے اس سے ناواقف رہے ہوں۔ پھر کیا آج اگر اس طرح کی کوئی آئت ہمیں کسی صحابی سے پہنچے۔ تو ہم اُسے قرآن کا حصہ مان لیں گے۔ اسی سے تو باطنیہ اور رافضیہ نے فائدہ اٹھایا ہے۔ سوال یہ ہے۔ کہ آنحضور کا جو ارشاد صرف ایک صحابی کے علم میں آیا۔ ایسا رازداری کا حکم آپ نے فرمایا کیوں؟ اپنے اپنائے زمانہ سے خود آپ کو اور اس صحابی کو کیا بگاڑ تھا۔ ہمارے نزدیک جس طرح قرآن متواتر ہے۔ بالکل اسی طرح اسوہ محمدیؐ بھی متواتر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے جاں نثاروں کی جو جماعت تیار فرمائی تھی۔ اس کا ہر فرد اس بات

ے اہلحدیث کی طرف سے اپنا الگ قرآن بنانے کا رجحان بھی شروع ہوگیا۔ نا یللہ...

کا پابند تھا۔ کہ آپؐ کا جو حکم وہ پاتا۔ دو مردوں کے سامنے لاتا اور خود اس پر عمل کرتا۔ اُسے صدری نسخہ بنائے رکھنا کسی کے لئے جائز نہ تھا۔

تیسری بات کہ قرآن کے تصریح خلاف ہے۔ اس کے پانچ وجوہ ہیں۔
اول قرآن میں غیر آباد بیوی کی عدت کا حکم نہیں دیا گیا۔ اور یہ روایت ہر بیوی کی عدت کو لازم ٹھہراتی ہے۔ دوم قرآن میں حامل بیوی کی عدت مدت حمل تک ہے۔ اور یہ روایت اس کے لئے بچہ جننے کے بعد بھی چھ طلاق کا حکم باقی رکھتی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے۔ کہ ابھی اس کی عدت باقی ہے۔ وضع حمل سے ختم نہیں ہوئی۔ سوم۔ قرآن میں عدت کے ساتھ طلاق دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ اگر عدت کے بلا لحاظ طلاق واقع نہ ہوتی تو ایسے حکم کے کوئی معنے تھے۔ اگر قتل کرنے سے کوئی آدمی نہ مرتا۔ تو ظاہر ہے۔ کہ نہ قتل کی مخالفت ہوتی۔ اور نہ اُس کے قصاص کا حکم۔ چہارم قرآن میں خاوند کو ایک یا تین طلاق کا پابند نہیں کیا گیا۔ مگر یہ روایت ہر خاوند کو تین بار تو عدد طلاق دینے کا پابند کرتی ہے۔ پنجم۔ قرآن میں عدت کی مدت تین حیض ہے۔ اور ہر حیض کے بعد ایک طلاق دینے کی ہدایت ہے۔ اور یہ بھی ہے۔ کہ حامل مطلقہ کی عدت وضع حمل تک ہے۔ معلوم ہوا۔ کہ تین حیض میں طلاق پوری کرنا لازم اور ضروری نہیں ورنہ پہلے حکم کے بعد اس حکم کے کوئی معنے نہ تھے۔

ان پانچ وجوہ سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے۔ کہ طلاق دینے میں اصل ضابطہ عورت کے حالات کا لحاظ ہے۔ نہ کہ خاوند کے مصالح کا۔ چنانچہ غیر آباد بیوی کے ہاں حمل کا کوئی امکان نہ تھا۔ اس لئے اسے طلاق کے بعد عدت کے بغیر آگے نکاح کا اختیار دیا گیا ہے۔ مگر خاوند کے مصالح جیسے آباد بیوی کے ساتھ ہوتے ہیں۔ اور جیسے غیر آباد کے ساتھ۔ اسی طرح حامل عورت چونکہ حمل سے ہوتی ہے۔ اس لئے طلاق کے بعد اسے مدت حمل گزارنے کا حکم دیا گیا نہ تین حیض کا اور نہ تین ماہ کا۔ یہ صحیح ہے کہ قرآن میں عدت کا لحاظ رکھ کر

طلاق دینے کا حکم فرمایا گیا ہے۔ مگر قرآن میں قرضہ دے کر لکھوانے اور اس پر شہادت قائم کرنے کا بھی تو حکم فرمایا گیا ہے۔ جس کا یہ مطلب کبھی نہیں۔ کہ کتابت اور شہادت نہ ہونے سے قرضہ قرضہ ہی نہ رہے۔ نہ یہ کہ جو آدمی اپنے قرضہ کی پرواہ نہ کرے اُسے اُس کی پرواہ کرنے پر مجبور کیا جائے۔

چوتھی بات کہ اس روایت میں شیعی ذہن کام کر رہا ہے۔ سب سے بڑا ثبوت اس کا یہ ہے۔ کہ شیعہ مذہب کے اپنی بنیادوں پر استوار ہونے سے پہلے اس روایت کا دنیا میں کوئی وجود نہ تھا۔ عہد رسالتؐ اور زمانہ صحابہؓ میں کوئی ایک مثال بھی اس کے لئے نہیں پائی جاسکتی۔ اور بعد میں اہل حدیث سے پہلے وہ اس پر کاربند ہوئے[1]

دوسرا یہ کہ یہ ابن عباسؓ سے بیان کی جاتی ہے۔ متعہ کی اور اہل شیعہ کی دوسری خصوصی روایات بھی زیادہ تر انہیں سے ہیں۔ حالانکہ وہ خود متعہ کو حرام سمجھتے ہیں۔ بالکل اسی طرح تین طلاق کو بھی وہ قطعی سمجھتے تھے۔ اہل شیعہ کی جن روایات کا حصہ ابن عباس سے آیا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ان میں دو باتیں نمایاں ہوتی ہیں۔ وہ قرآن کے خلاف ہیں اور ان میں خلفا کے کارنامے ہیں۔ اس روایت کی بھی یہی[2] نشان ہے۔ یہ قرآن کے خلاف ہے۔ اور اس میں حضرت عمرؓ کا نہ کارنامہ ہے پہلی بات سے ان روایات کو اہل شیعہ نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور دوسری وجہ سے وہ محدثین نے قبول کیں۔ ایسی روایات کی شناخت کا اب صرف یہ ذریعہ ہے کہ وہ جس زمانہ سے تعلق رکھتی ہوں اس میں اُن کے نظائر و شواہد پر نظر کی جائے

---

[1] اب اگر شیعہ کی دیکھا دیکھی اہل حدیث متعہ کو بھی مان لیتے ہیں۔ تو پھر یہ دونوں ایک ہی گھاٹ سے پانی پئیں گے۔

[2] اس ذیل میں وراثت۔ فدک۔ کاغذ وقلم۔ متعہ۔ جمع قرآن خلافت اول وسوم میں اور اس طرح کی دوسری روایات ہیں۔

شیعیت کا تیسرا پہلو اس میں تقیہ کا ہے۔ اس کے راوی حضرت ابن عباسؓ ہیں۔ جو زمانہ نبوت سے لے کر واقعات کربلا کے بعد تک زندہ رہے۔ عہد نبوت میں انہوں نے دیکھا۔ کہ لوگ قرآن کے خلاف چل کر تین طلاق کو ایک بنا رہے ہیں۔ مگر وہ چپ سادھے رہے۔ جیسے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہنسی خاموش رہنا چاہیئے تھا) وہ وقت گیا اور نوبت حضرت عمرؓ کی آئی۔ وہ جب "تین مساوی ایک" والا پرانا ضابطہ موقوف کرنے لگے۔ تو ابن عباسؓ نے پھر بھی اٹھ کر اتنا نہ کہا کہ عمرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ضابطہ کو توڑ کر کیا غضب کر رہے ہو۔ بعد میں جب میدان خالی پایا تو انہوں نے (انہیں بلکہ ان کے نام بیان کرنیوالے) نے لوگوں سے بتایا۔ کہ یہ کچھ رسولِ خدا کے زمانہ میں تھا۔ اور یہ کچھ عمرؓ کی کمائی ہے اور یہ بتانا پھر بھی چھوڑ دیا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ بات اول سے آخر تک گول ہی رکھی۔ اس کا نام ہے۔ دوسرے لفظوں میں تقیہ۔ پھر انداز بیان ایسا الجھا ہوا ہے کہ کچھ پتہ نہیں چلتا۔ کہ پہلے تین کو ایک کیوں بنایا گیا۔ اور پھر تین کو تین بنانے کی ضرورت کیا پیش آئی۔

شیعیت کا چوتھا پہلو اس میں تفرقہ ہے۔ خود لفظ شیعہ کے معنی ہی ٹولی اور گروہ بندی کے ہیں۔ جب یہ روایت بیان کی گئی۔ تو لوگ ایک طریقہ پر ہی طلاق دیتے تھے۔ اور وہ تھا ۱ = ۱ ، ۳ = ۳ چنانچہ جامع ترمذی میں امام ترمذیؒ نے طلاق کے مختلف مذاہب میں اس اختلاف کا ذکر نہیں کیا۔ جس کا مطلب ہے کہ کم از کم ان کے زمانہ تک اہل شیعہ بھی اس روایت سے واقف نہ تھے اور نہ ان کا اس پر عمل تھا۔ اس کے علاوہ کوئی درجن ایک احادیث سے ثابت ہے۔ کہ تین طلاق بیک وقت واقع ہو جاتی ہیں۔ اہل حدیث ان کو جانتے تک نہیں۔ یہ ہے کڑوا تھو اور میٹھا ہڑپ کی مثال

مذاہب کا اختلاف مسلمانوں کے درمیان ہر زمانہ میں رہا ہے۔ مگر اپنی رائے کو سنت اور توحید کا نام دے کر دوسروں کے عمل کو بدعت اور شرک کہہ گزرنا اہلحدیث

کے حصہ میں آیا ہے۔ یہ ہر بات میں دوسروں سے الگ ہیں "صحیفہ اہل حدیث" کے صفحہ اول پر عرصے سے اہل حدیث کے "مسنون قرأت والے" "قرآن" کا اشتہار سوہان روح بنا ہوا ہے۔ اور یہ ابتدا ہے ہر فرقہ کے علیحدہ قرآن بنانے کی۔ یہ ترکیب بھی پیچھے گھوڑا اور آگے بگھی والی ہے۔ آج تک تو سنت کو قرآن سے پرکھا جاتا تھا۔ اب سنت سے معلوم کیا جائے گا۔ کہ "قرآن کی کونسی قسم" صحیح ہے۔ اہل شیعہ کا ستر گز اور چالیس پاروں والے قرآن کا نعرہ اس قدر مضر نہیں تھا۔ جتنا مضر یہ مسنون قرأت کے قرآن کا معصوم شغل ہے۔

اہل شیعہ کا مسلک

دیوبندی بریلوی اور اہل حدیث تینوں کا مجموعہ اہل سنت ہے۔ یہ نام اہل السنت والجماعت سے مختصر ہے۔ یعنی وہ گروہ جو سنتِ رسولؐ جماعت صحابہؓ اور جمہور مسلمین کے طریقہ پر عامل ہو۔ اس وقت یہ نام اپنی معنویت کھو چکا ہے۔ کیونکہ عام طور پر مسلمان اس وقت دو حصوں میں تقسیم ہیں۔ ایک وہ جو دین کے کسی ایک مسئلہ کو پورا دین سمجھ بیٹھے ہیں۔ دوسرے وہ جو دین سے باہر کا کوئی اصول لے کر اسے دین بنا چکے ہیں۔ اس لئے وہ اہل السنت نہیں۔ جو بات دیوبندیوں۔ بریلویوں اور شاید اہل حدیث کو اہل السنت بناتی ہے۔ وہ یہ کہ یہ تینوں سنت رسولؐ اور اجماع امت کو دلیل مانتے ہیں۔

قرآن اور حدیث کا مفہوم پانے کے لئے اہل السنت صحابہؓ اور تمام مسلمانوں کے متفقہ اصول سے نہیں نکلتے۔ چاہے کسی ایک مسئلہ میں ہو۔ اس میں مسلمانوں کی تاریخ بھی آجاتی ہے۔ قرآن و سنت اور اجماع کے بعد دیکھنا ہے۔ کہ اجماع و اتفاق کیا چیز ہے۔ اور اس کا کونسا مفہوم درست ہے۔

انسان غلطی کے بغیر نہیں رہتا اور بڑی بڑی غلطیاں کر جاتا ہے۔ پھر وہ مسلمان ہو کر قرآن سمجھنے میں بھی دھوکہ کھاتا ہے۔ یہ ممکن ہے۔ کہ ایک مسلمان قرآن

سے جوبات رہے۔ تمام اہل مذہب والا مذہب لوگوں کے ہاں غلط ہو۔ اور ہوسکتا ہے۔ کہ وہ اپنے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ملا لے۔ ان دو گونہ امکانات سے بچنے کے لئے اجماع کام آتا ہے۔ اب اگر ہم اجماع سے بعض خاص لوگوں کا متفقہ اہل علم کا اتفاق مراد لیں۔ تو اس سے دوسرے نقصان کا علاج نہیں ہوسکتا۔ اس لئے اجماع سے مراد تمام خاص و عام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ اگر کچھ علماء ایک مسئلہ پر جمع ہوجائیں اور جمہور ان کا ساتھ نہ دیں۔ تو ان کے اتفاق کو اجماع اُمت کا نام نہیں دیا جاسکتا

اہل سنت کی ان خصوصیات سے آپ غور کریں۔ کہ اہل شیعہ کے اس عقیدہ و مسلک سے یکسر الگ رکھنے کے وجوہ کیا ہیں۔ تشیعہ مذہب کی حقیقت معلوم کرنے میں دنیا بُری طرح ناکام رہی ہے۔ یہ مذہب مختلف ادوار سے گزر کر مختلف فرقوں میں بٹا۔ اس بنا پر اس کا مستند ماخذ تلاش کرنا آب حیات تلاش کرنے سے زیادہ دشوار ہے۔

اطاعت خدا اور رسولؐ پر اہل شیعہ اور اہل السنت دونوں متفق ہیں۔ آگے اہل السنت خدا اور رسول کی اطاعت کے تحت ہر اس شخص کی پیروی کے قائل ہیں جو نیک ہو اور نیکی کا حکم دے۔ اہل شیعہ کہتے ہیں۔ کہ اللہ اور رسولؐ کے ساتھ امام معصوم کی پیروی باعقیدت بھی ضروری ہے۔ امیر کی اطاعت ہر امر میں کی جاتی ہے۔ اور یہ اُسی وقت ہوسکتا ہے۔ کہ وہ غلطی نہ کرے۔ یا غلطی کر لینے سے مواخذہ کے قابل نہ ہو۔ مگر اپنے مجتہدین مذہب کے پیچھے چل کر وہ اس اصول پر

لہ زمانہ حال میں اس کی واضح مثال کانگریسی علماء کی سرگزشت ہے۔ انہوں نے باوجود علامہ دہر اور زیرکی و مدنی ہونے کے کانگریس کا ساتھ دینے اور لیگ کے خلاف چلنے میں جو دلائل دیئے وہ عوام میں سے کسی ایک کے دل میں بھی اُترے۔ اُدھر لیگ کے دنیا دار قسم کے لوگوں نے جب پاکستان اور اسلامی حکومت کا غلغلہ بلند کیا تو سب مسلمان ان کے پیچھے چل پڑے۔

قائم نہیں رہتے پھر انبیاء و رسولوں پر ایمان لانے کے احکام سے قرآن بھرا پڑا ہے مگر امام معصوم پر ایمان لانے کا کہیں حکم موجود نہیں۔

اس سے بڑھ کر اہل شیعہ کے ہاں امام کا درجہ نبی سے بڑا ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کو جب خدا نے امامت کی بشارت فرمائی۔ تو اس سے پہلے وہ نبی تو تھے ہی۔ معلوم ہوا کہ امام معصوم کا مرتبہ نبی سے افضل ہے۔

یہ استدلال بہت بڑے مغالطہ کا باعث ہے۔ اوّل تو یہی بات ثبوت طلب ہے۔ کہ حضرت ابراہیمؑ پہلے نرے نبی تھے۔ اور پھر امام بنی ہوئے۔ دوسرے قرآن میں تمام انبیاء علیہم السلام کو نیکی کا امام فرمایا گیا۔ اور مسلمانوں کو پرہیزگاروں کا امام بننے کی دعا سکھائی گئی۔ تیسرے ایک کام یا عہدہ کا بعد میں دیا جانا یہ معنے کب رکھتا ہے۔ کہ وہ کام پہلے تمام کاموں سے افضل ہے۔ حضرت نوحؑ تمام عمر نبوت کرتے رہے۔ جب ان کی قوم کے غرق ہونے کا وقت آیا۔ تو خدا نے انہیں حکم دیا۔ کہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہماری وحی سے کشتی تیار کرو۔ کیا اس سے یہ ماننا لازم آتا ہے۔ کہ بڑھئی کا مرتبہ نبی سے افضل ہوتا ہے۔

اصل میں ہر نبی کے اندر بعض خصوصیات زیادہ ہوتی ہیں جو نمایاں کی جاتی ہیں۔ حضرت اسمٰعیلؑ کو وعدہ کا پابند اور حضرت یوسفؑ کو حسین اور دیانتدار جو فرمایا گیا تو اس لئے کہ ان حضرات میں یہ اوصاف زیادہ اور نمایاں تھے۔ حضرت ابراہیمؑ میں بھی امامت کی صفت زیادہ تھی۔ مسلمان۔ یہود۔ نصاریٰ مشرکین عرب اور تمام دُنیا کی قومیں انہیں آج بھی اپنا امام یا بڑا انسان ماننے پر متفق ہیں۔ دوسروں کا یہ حال ہے۔ کہ انہیں مسلمان مانتے ہیں۔ تو یہود نہیں مانتے۔ یہود مانتے ہیں۔ تو عیسائی نہیں مانتے۔ عیسائی مانتے ہیں۔ تو مشرکین نہیں مانتے

امام معصوم کی نامانوس باتوں سے بچنے کے لئے تقیہ کا ضابطہ ایجاد کیا گیا۔ یعنی یہ کہ امام کی جو بات اس کے ماننے والوں کو پہنچی۔ اور وہ پسند آگئی۔ اسے آگے دوسروں

تک پہنچا دیا گیا اور جو پسند نہ آئی اُسے تقیہ کی پیداوار ٹھہرایا۔ تقیہ اس کیفیت کو
کو کہا جاتا ہے جس میں رہ کر انسان اصل حقیقت کو چھپا ڈالتا ہے۔ اس سے ایک
ہی بات اور ایک ہی واقعہ پر مختلف لوگوں کے ہاں مختلف نظریات قائم ہو
گئے اور وہی آگے چل کر دین کا مقام حاصل کر گئے۔

اہل سنت متفقہ طور پر انبیاء کی اور صرف انبیاء کی عصمت کے قائل ہیں
اور ان کی عصمت ان کی وحی کے طفیل مانتے ہیں۔ اس عصمت کے فہم اور بیان
میں کبھی کبھی ان کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے جو محض نظری قسم[1] کا اختلاف
ہوتا ہے۔ قرآن میں جو انبیاء کی کوتاہیوں کی ناقدانہ اشارات ملتے ہیں ان کے سمجھنے میں مغالطہ ہو جاتا ہے

---

[1] مولانا مودودی انبیاء علیہم السلام کو معصوم ماننے کے ساتھ یہ بھی فرماتے ہیں۔ کہ "ان سے کچھ غلطیاں
ہو جاتی تھیں۔ کچھ غلطیوں کی تو انہوں نے نشاندہی کی ہے اور کچھ کے متعلق یہ اصول بیان کیا کہ
خدا نے بعض غلطیاں اس لئے ان سے کرائیں کہ کہیں لوگ انہیں خدا نہ سمجھیں اور اُن کی
غلطیوں کو نگاہ میں رکھیں۔ لطف یہ ہے کہ یہ مقدمہ غلط ہونے کے ساتھ خود ان کے ایک عنوان کے خلاف ہے
وہ فرماتے ہیں۔ کہ متقی وہ ہوتا ہے جو اپنے ذمہ فرائض کو پوری طرح ادا کرے اور محسن وہ ہوتا
ہے۔ جو فرائض سے بڑھ کر خدا کی خوشنودی میں محنت دکھائے۔ اس اصول کے تحت تو ہم
متقی کو بھی غلط کار نہیں کہہ سکتے۔ کجا یہ کہ محسن۔ اور اس سے بھی بڑھ کر نبی کے متعلق غلطی کا
تصور باندھیں۔ پھر انہوں نے غلطیوں کے لئے جو علت بیان کی ہے۔ اس سے لازم آتا ہے
کہ وہ غلطیاں ایسی بڑی اور سنگین قسم کی ہوں۔ کہ ہر وقت ہر خاص و عام کی نگاہ میں رہیں۔
مگر حضرت عیسیٰ کی غلطیاں نہ انہیں خدا ماننے والوں کو نظر آئیں۔ اور نہ خدا نے ان کی
خدائی کے رد میں ان کا ذکر فرمایا معلوم ہوا کہ ان کا کوئی وجود نہ تھا۔ انبیاء سے پیچھے اُتریئے
تو حضرت علیؓ کو خود ان کے زمانہ میں خدا مانا گیا۔ لیکن یہی باطل خدائی ان کی حقیقی معصومیت
کی بنیاد ہوئی معلوم ہوا کہ کسی کو خدا اور معصوم بنانے والے ایسے بال سے باریک غلطیوں کے پابند
نہیں ہوا کرتے اور کہ یہ اصول غیر انبیاء کے حق میں بھی درست نہیں۔ اصولی یہ بات

اور پھر غیر انبیاء کی عصمت کے وہ قائل نہیں۔ البتہ وہ تمام صحابہ کو عادل مانتے ہیں۔ اہل
تشیع میں سے کچھ انہیں مسلمان بھی نہیں سمجھتے اور کچھ تفضیل[1] کے قائل ہیں۔ اس سے

درست نہیں۔ کہ غلطی نہ کرنے پر آدمی خدائی کے مقام تک پہنچ جاتا ہے۔ یا ہر غلطی
سے بچنا ممکن نہیں۔ کیونکہ خدا نے ہمیں ہماری طاقت کے مطابق احکام دیئے ہیں
حضرت یونسؑ کی غلطیوں" میں مولانا مودودی کا ارشاد ہے۔ کہ مفسرین نے بھی
انہیں کی رائے کے مطابق لکھا ہے۔ مگر داڑھی کے مسئلہ میں انہیں فقہاء
و مفسرین کا اجماع بالکل دکھائی نہیں دیتا۔ اسے استنباطی مسئلہ بنا کر داڑھی کو چھوٹا
کرتے ہیں۔ حالانکہ ابن ہمام نے لکھا ہے۔ کہ داڑھی کا قبضہ سے کم کرنا کسی نے جائز
نہیں کہا۔ اور در مختار میں ہے کہ قبضہ سے کم کرنا حرام ہے۔ حضرت عمر، ابن عمر اور
ابو ہریرہ جیسے اکابر صحابہ کے عمل سے ثابت ہے۔ کہ داڑھی کی مقدار قبضہ ہے۔ کیا
ایک بے حس بات کے لئے مفسرین کی آڑ لی جاتی ہے۔ اور صحیح عمل میں اُن کا
ساتھ نہیں دیا جاتا۔ قومی انعامی بانڈ کو انہوں نے جائز کہا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔
کہ گاہکی بڑھانے کے لئے ایک آدمی کا اپنے خریداروں کو رعایت دینا جائز ہے
اور انعامی بانڈ یہی کچھ ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے بعض لوگ معمہ بازی کو دماغی ورزش
کہہ کر جائز کہتے ہیں۔ کیا انعامی بانڈ رعایت ہے بھی یا نہیں جہاں تک عرف کا
تعلق ہے۔ تجارتی رعایت سے ایک فریق کا یقینی نقصان ہوتا ہے۔ اور دوسرے
کو یقینی فوری نفع۔ ایک آدمی اگر ایسا نہ نکلنے والا مال بازار سے کم نرخ پر دے
تو اُسے اتنا روپیہ نہیں ملے گا۔ جو پورے نرخ پر فروخت کرنے سے اسے ملتا تھا۔
اس کی اس قربانی سے خریداروں کو فوری فائدہ پہنچے گا۔ یہ ہے تجارتی رعایت
مگر جہاں اس رعایت کے فائدہ کا دو طرفہ امکان ہو وہیں سے یہ جوا ہو جاتی ہے۔
پھر معروف رعایت کی وجہ معقول ہوتی ہے۔ مثلاً اس کا حصول سب لوگوں کے
لئے ممکن ہو یا وہ دینے والے کے کسی خاص تعلق کی بنا پر کسی ایک خریدار کے حق کی جائے
یہ پوزیشن انعامی بانڈ کی نہیں اور نہ اس میں رعایت کا کچھ تناسب ہوتا ہے۔

[1] واضح رہے کہ تفضیل و تکفیر کا نتیجہ ایک ہی ہے۔

ان کے درمیان صفاتِ باری میں "نقص" اور "اجماع علی الخطا" اور اختلافِ قرأت جیسے ناقابلِ حل مسائل پیدا ہو گئے۔ مثلاً صحابہؓ کی غلطیوں کے باوجود خدا کا ان کے فضائل بیان کرنا۔ صحابہؓ کا انتخابِ خلیفہ میں غلطی پر جمع ہو جانا وغیرہ۔ مگر قرآن میں امت کی اکثریت کا حق پر ہونا واضح ہے۔ اس میں مسلمانوں کے معروف کو معروف اور ان کے منکر کو منکر فرمایا گیا ہے۔

اختلافِ قرأت سے قرآن کا ایک لفظ ایک سے زیادہ شکلوں کے ساتھ پڑھا جاتا ہے[1]۔ اہلِ شیعہ نے اس کے سہارے پاؤں کے مسح اور متعہ جیسے مسائل قرآن سے ظاہر کئے۔ پاؤں کے مسح کا اختلاف تو لفظی ہے۔ متعہ کو مولانا مودودی زنا سے کم گناہ بتاتے ہیں۔ یہ شاید اہلِ شیعہ کی تالیف کے لئے۔ ورنہ یہ قرآن کے خلاف کھلی بغاوت ہے۔ اور ابن عباس کی روایات سے جو اس کی تائید کی جاتی ہے وہ منجملہ ان بہتانوں کے ہے۔ جو اس مذہب والوں نے صحابہؓ اور آئمہ پر باندھے ہیں۔ ایک طرف یہ معصومین کے پیرو ہیں۔ اور دوسری طرف متعہ۔ تقیہ اور تبرّی جیسے مسائل لاتے ہیں۔ جن کی بدولت آدمی دین سے بھی بدظن ہوتا ہے۔

ترتیب اور حفاظتِ قرآن کے بارہ میں ان کا اعتقاد چند ایک روایات پر ہے۔ جن سے یہ بات سامنے آتی ہے۔ کہ قرآن حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت عمرؓ کی بڑی منت سماجت کے بعد جمع کرایا تھا۔ وہ کہتے رہے کہ جو کام رسولِ خدا نے نہیں کیا۔ میں کیسے کروں؟ پھر لوگ مختلف قرأتوں کے ساتھ قرآن پڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ حضرت عثمانؓ نے ایک قرأت پر لکھ کر باقی نسخے جلا دیئے۔ اس کا مطلب ہوا کہ قرآن کو صحابہؓ اور خلفاءؓ نے جمع کیا۔ اس کی ترتیب قائم کی۔ اور اس کی مختلف خرابیوں میں اصلاح کی۔ حالانکہ دنیا میں ایک انسان کی لکھی ہوئی کتاب دوسرا انسان جمع نہیں کر سکتا۔ اور قرآن میں موجود ہے۔ کہ اسے خدا نے جمع فرمایا اور ترتیب کے ساتھ اسے پڑھنے کا ڈھنگ بتایا۔ واللہ اعلم

[1] مولانا مودودی کہتے ہیں کہ قرآن مختلف قرأتوں کے ساتھ نازل ہوا اسکے نمونے تو کبھی کبھی کوئی کتاب دنیا میں دستور و آئین کتنی ایک سے زیادہ عبارت کے ساتھ نہیں ہوا اور مصنف جب اپنی کتاب میں نظر ثانی کرتا ہے تو قابلِ ترمیم عبارات کو دوبارہ اس میں نہیں لاتا۔ کہاں خدا کی قدرت اور علم یہ مسئلہ صرف زبانی ادا اور حافظ کے فرق کی پیداوار ہے۔